JUNE
2025
جدید ادب کا اشاریہ
ماہنامہ
لاہور
بیاض

جناب خالد احمد گورنر پنجاب جناب لطیف کھوسہ سے
پرائیڈ آف پرفارمنس ایوارڈ وصول کرتے ہوئے

جناب خالد احمد، جناب عطاالحق قاسمی، جناب عمران منظور

جناب عمران منظور، جناب خالد احمد، جناب سجاد شیخ

جناب خالد احمد، جناب اعجاز رضوی غم گرفتہ کی تقریب پذیرائی

جناب ریاض مجید، جناب خالد احمد، جناب نجیب احمد

جناب خالد احمد اپنے صاحبزادوں
جناب ثمر احمد، جناب جاوید احمد کے ساتھ

غزل

غموں کا زہر کب سے پی رہے ہیں
نہ جانے کس طرح ہم جی رہے ہیں

وہ دکھ تو رنگ تھے اک تیرے دکھ کے
وہ دکھ بھی اب کہاں باقی رہے ہیں

ہوا کے ساتھ چکرائے ہیں در در
ہوا کے ہم سفر ہم بھی رہے ہیں

حریصِ لذتِ آزار خالد
کبھی ، ہم بھی ترے ساتھی رہے ہیں

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 37083901-9
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5252311 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 33 - جون 2025 - شمارہ نمبر: 6

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: خالد احمد

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور پرنٹر پبلشر و مدیر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر نزد سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِی فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز، افروز رضوی، سرور حسین نقشبندی	7 تا 10
2	نعت	سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، اکرم ناصر، مظہر امام مرور حسین نقشبندی ، اعجاز دانش ، نوید عاجز	11 تا 17
3	عقیدت	محمد انیس انصاری، خاور اعجاز، طارق بٹ، انفر حسن مرزا آصف رسول، فیض رسول فیضان	18 تا 23
4	رباعیات	گلزار بخاری، سعید اشعر، محمد نصیر زندہ، نوید عاجز	24 تا 27
5	ہائیکو	نسیم سحر	28
6	دفاعِ وطن (10 مئی کے حوالے سے)	مسعود احمد ، اقبال سروبہ ، پروین سجل	29 تا 31
7	دائم آباد گوشۂ خالد احمد	شاعری: خالد احمد	32 تا 47
8	مضامین	جلیل عالی، خاور اعجاز، نذر عابد، مسعود احمد، افتخار الحق ثمینہ سیّد، سید تحسین گیلانی، آفتاب احمد خیر پوری سیف اللہ بھٹی، عمر فاروق وڑائچ	48 تا 87
9	مائکرو فکشن	شہزاد نیّر، سید تحسین گیلانی، عاصم بخاری، بابر امین ابر خالد نذیر، حامد حسن، عامر انور	88 تا 96

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
10	غزلیں	آصف ثاقب، انور شعور، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، نثار ترابی ناصر علی سید، خاور اعجاز، باقی احمد پوری، یعقوب پرواز منظور ثاقب، عقیل رحمانی، راحت سرحدی، طارق بٹ مسعود احمد، طالب انصاری، اقبال سروبہ، واجد امیر شریف ساجد، افتخار شاہد، رضا اللہ حیدر، سلیم فگار، محمد انیس انصاری افتخار الحق، شوکت محمود شوکت، اکرم ناصر، اکرم سحر فارانی ہمایوں پرویز شاہد، احمد جلیل، صغیر احمد صغیر، اصغر علی بلوچ شاہنواز زیدی، خالدہ انور، رخشندہ نوید، افروز رضوی سرور حسین نقشبندی، ندیم ملک، نبیل احمد نبیل، علی رضا آفتاب خان، شبہ طراز، شبیر نازش، محمد اشفاق بیگ قمر نیاز، اجمل اعجاز، مظہر امام، سرور فرحان، وسیم جبران علمدار حسین، راجہ عبدالقیوم، اکرم جاذب، ساگر حضور پوری اعجاز دانش، محمد اشرف کمال، بشیر احمد حبیب، جیا قریشی نائلہ راٹھور، کوکی گل، شاہ روم خان ولی، نعمان محمود یاسر رضا آصف، امجد خان تجوانہ، حسن پرویز سید، عمر عظیم چشتی مستحسن جامی، اکرام الحق سرشار، امجد مرید حیدری، سید تیمور کاظمی مشیر جعفری، اویس اکبر، سمیع احمد ثمر، عابد رضا، اعجاز رضوی	97 تا 166
11	افسانے	بلقیس ریاض، سلمیٰ اعوان، ثمینہ سید، [سلیمہ حسین/ مترجم: حمزہ حسن شیخ] وسیم جبران، کومل شہزادی	167 تا 211
12	طنز و مزاح/ خاکے	سیدہ آمنہ ریاض، نور کمال شاہ، نوید عاکل، اعجاز رضوی	212 تا 224
13	نظمیں	جلیل عالی، نسیم سحر، مظہر اعجاز مظہر، سلیم فگار، عماد اظہر درِدانہ نوشین خان، رخشندہ نوید، ریاض ندیم نیازی، نائلہ راٹھور ارشد محمود ارشد، فیض رسول فیضان، ابنِ حسین شعیب الرحمٰن علی حسین عابدی، فصیحہ آصف خان، سیدہ فاطمہ جبیں بشریٰ شیریں، عبداللہ نوید، اعجاز رضوی	225 تا 241

حمد

ازل سے بھی پہلے ، ابد کی صدا
خدا ہی خدا ہے ، خدا ہی خدا

یہاں بھی، وہاں بھی ، کہاں وہ نہیں
وہ سارے جہانوں کا فرمانروا

نہیں اس کی بخشش کی کوئی مثال
کہ جو جس نے مانگا سوا دے دیا

مدد اس سے مانگی جو منجدھار میں
سفینہ کنارے پہ فوراً لگا

کوئی بھی ہو درپیش مشکل کہیں
کرم اس کا واحد ہے مشکل کشا

کہیں بھی جو ظاہر میں باطن میں ہے
نہیں ہے وہ ہرگز خدا سے چھپا

جو احکام اس کے ہیں قرآن میں
بجا لانا ان کا ہے سب کو روا

کرم اُس کا سب سے بڑا یہ ہوا
بفیضِ خدا ہیں ملے مصطفیٰ

کریں اتباع اس کے محبوبؐ کی
ہے توحید کا بھی یہی مدعا

ریاضِ عمل میں خیانت نہ ہو
کہ من بھاتا اس کا ہے صدق و صفا

سید ریاض حسین زیدی

حمد

خاور اعجاز

جِنّ و ملائک و بنی آدم میں دھوم ہے
اُس ذاتِ کبریائی کی عالم میں دھوم ہے

تحت الثریٰ کی آخری حد میں ہے اُس کی گونج
اور آسماں کے گنبدِ ہفتم میں دھوم ہے

اُتر میں اُس کا ذکر ہے، دکھّن میں اُس کی یاد
پُورب میں اُس کا غلغلہ پچھم میں دھوم ہے

بامِ فلک پہ قریۂ کوثر ہے نغمہ ریز
صحنِ زمیں پہ کوچۂ زمزم میں دھوم ہے

ہر ذرّہ اُس کی حمد میں مصروفِ کار ہے
یعنی کہ کوہ و صحرا و قلزم میں دھوم ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھتا کون ایک پل رُک کر
رقصِ یارانِ بے سر و دستار

حمد

فلک موجود سے جو کچھ عیاں ہے
وہی ظاہر بھی ہے ، وہی نہاں ہے

تجلی ہے اسی کی کہکشاں میں
نمودِ حسن بے صورت کہاں ہے

گواہی دے رہا ہے وہ بھی رب کی
جو تاروں کا حسیں یہ کارواں ہے

اسی کی بادشاہی ہے، یہ جو کچھ
زمین و آسماں کے درمیاں ہے

خرد کیسے کرے اُس کا احاطہ
تخیل میں وہ آتا ہی کہاں ہے

سرِ قرطاس جو کچھ لکھ رہی ہوں
قلم یہ شوق سے از خود رواں ہے

کرم افروز پر ہے سوہنے رب کا
مری ہر سانس اُس کی نغمہ خواں ہے

افروز رضوی

حمد

یہاں حشر کیسا بپا ہو گیا ہے
خدایا زمانے کو کیا ہو گیا ہے

عجب ہے کہ وہ بھی تیرے ہی بندے
ستم جن کو راحت فضا ہو گیا ہے

ترے در پہ وہ بھی جھکے جا رہے ہیں
زر و مال جن کا خدا ہو گیا ہے

یہاں بے سبب لوگ مرنے لگے ہیں
نہتوں کا خوں اب روا ہو گیا ہے

جبھی تو یہاں دندناتے ہیں ظالم
کہ مجرم یہاں بے خطا ہو گیا ہے

ترے نام لیوا ہیں دست و گریباں
بہت درمیاں فاصلہ ہو گیا ہے

مسلماں کی ذلت نہیں دیکھی جاتی
ترا حمد گر بے نوا ہو گیا ہے

تو سب جانتا ہے، تجھے سب خبر ہے
کہ درد اب تو حد سے سوا ہو گیا ہے

گلہ اور وہ بھی سر حمد سرور
تجھے آج کیا خوش نوا ہو گیا ہے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

وہاں جا کر مقدر کو سجا لیں
ہمیں آقاؐ مدینے میں بلا لیں

گھٹن بڑھنے لگی ہے کشتِ جاں میں
کبھی ہم بھی مدینے کی ہوا لیں

مجھے مل جائے گا عرشِ معلیٰ
خدارا آپؐ قدموں میں بٹھا لیں

جو ہریالی دلوں کی چاہتے ہیں
وہ دیکھیں سبز گنبد اور مزہ لیں

تمنا جن کی ہے قربِ الٰہی
وہ حبِ مصطفیٰؐ دل میں بسا لیں

تصور آپؐ کا دل میں بسا کر
کرم ہم آپؐ کا بے انتہا لیں

انہیں حبِ نبیؐ ہو گا میسر
خیالِ غیر جو دل سے مٹا لیں

کریں جو خواب میں انؐ کی زیارت
مزے تعبیر کے بھی وہ سوا لیں

شفاعت آپؐ کی دم ساز ہو گی
ندامت کے اگر آنسو بہا لیں

ریاضِ نعتؐ میں آنا ہے جن کو
وہ لہجہ حضرتِ حسان سا لیں

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

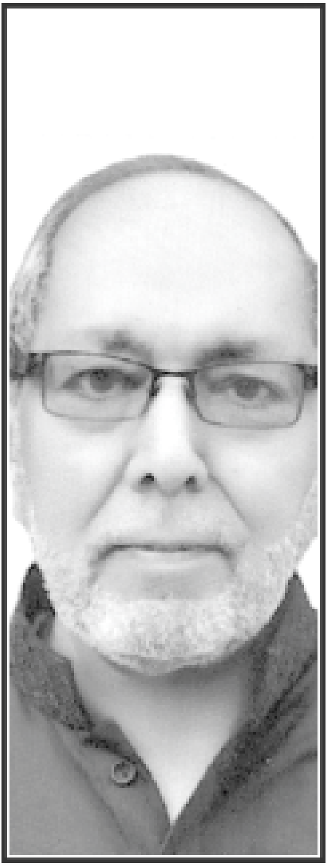

شہرِ نبیؐ کے اتنے منوّر گلیاں کوچے!
بانٹ رہے ہیں نور کے منظر گلیاں کوچے

میناروں سے روشنیوں کے چشمے پھوٹیں
روشنیوں کا ایک سمندر گلیاں کوچے

اب تک پھوٹ رہی ہے ان میں سے وہ خوشبو
خوش قسمت اس شہر کے سب گھر، گلیاں، کوچے

ان میں حضورؐ کے نقشِ پائے مبارک ہوں گے
دنیا میں یہ سب سے بہتر گلیاں کوچے

اِن سے سب کی راہ نمائی ہو سکتی ہے
دانش کے یہ مرکز و محور گلیاں کوچے

کیا مشکل ہے منزل کی جانب جانے میں؟
شہرِ مدینہ کے ہیں رہبر، گلیاں کوچے

نسیمِ سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

نعتؐ

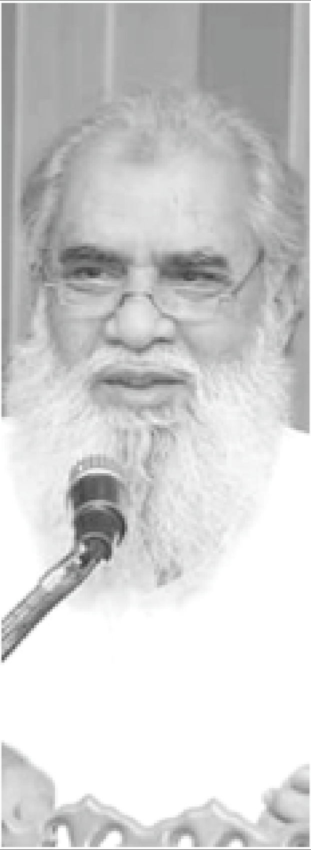

نکہتِ شہرِ مدینہ ادھر آتی جاتی
دید کی جوت مرے دل میں جگاتی جاتی

جس قدر یاد تری دل میں سماتی جاتی
تیری رحمت کی گھٹا اور بھی چھاتی جاتی

جتنا نزدیک ترے شہر کے آتا جاتا
تیری قربت مجھے ہر چیز بھلاتی جاتی

حسرتِ دید نے پھر روک لیا لوٹتے وقت
آنکھ پھر مانگنے تھی جھاتی کوئی جاتی

لوٹتے وقت مرے دل کو سکوں ہی کب تھا
مجھ کو ہر پل تری فرقت تھی رلاتی جاتی

آنکھ بے فیض نہیں لوٹ کے آئی اکرم
ہر قدم پر ہے نئے پھول کھلاتی جاتی

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تیرے اوصاف فقط تجھ سے بیاں ہوتے ہیں
نعت خود لکھی ، بہ پیرایۂ سیرت لکھی

نعتؐ

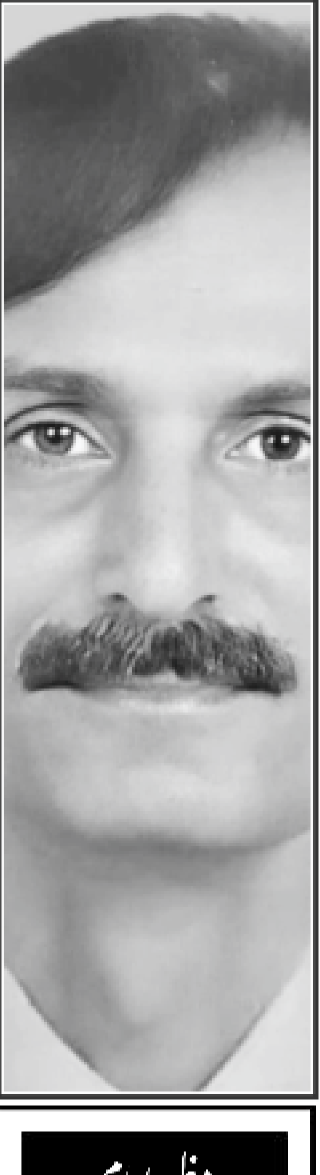

اے سرورِ کونین! کوئی تجھ سا نہیں ہے
توحید کے گلشن کا تو انمول نگیں ہے

سرکارِ دو عالم کا حوالہ ہے جہاں میں
وہ جس کی زمانے میں کوئی مثل نہیں ہے

وحشت کے سوا کچھ بھی نہیں بخت میں اُس کے
جس دل کو مدینے کی فضا راس نہیں ہے

سانسوں کا سفر اب اُنھی گلیوں میں کٹے گا
جینا بھی وہیں اب مرا مرنا بھی وہیں ہے

اُس یاد کو نسبت ہے شہِ کون و مکاں سے
جو یاد ہمیشہ سے مرے دل میں مکیں ہے

جیسے مرا ایمان ہے اُس خالقِ کُل پر
ویسے ہی مرا رحمتِ عالم پہ یقیں ہے

وہ شہر کہ مسکن ہے جہاں میرے نبی کا
میرے لیے وہ قریۂ فردوسِ بریں ہے

مظہر امام

نعتؐ

زندگی یوں معتبر ہونے لگی
یاد میں ان کی بسر ہونے لگی

جب مدینے کا ارادہ کر لیا
خامشی بھی ہم سفر ہونے لگی

وردِ لب رہنے لگا ذکرِ نبی
سوکھی ٹہنی با ثمر ہونے لگی

نام ان کے چاکروں میں آ گیا
بادشاہی خاک پر ہونے لگی

ان کی آل پاک پر بھیجا درود
بات کیسے پر اثر ہونے لگی

مشکبو رہتا ہے آنگن اس لیے
ان کی محفل میرے گھر ہونے لگی

بس گیا آنکھوں میں گنبد کا جمال
بے نگاہی دیدہ ور ہونے لگی

ان کی نسبت کے نرالے رنگ ہیں
مفلسی بھی تاجور ہونے لگی

یہ مدینہ ہے یہاں کیا پوچھیے
رات ہوتے ہی سحر ہونے لگی

آپ ہی اب کیجیے چشمِ کرم
ساری امت دربدر ہونے لگی

سارا سرور نعت کا فیضان ہے
شاعری رشکِ قمر ہونے لگی

سرور حسین نقشبندی

نعت ﷺ

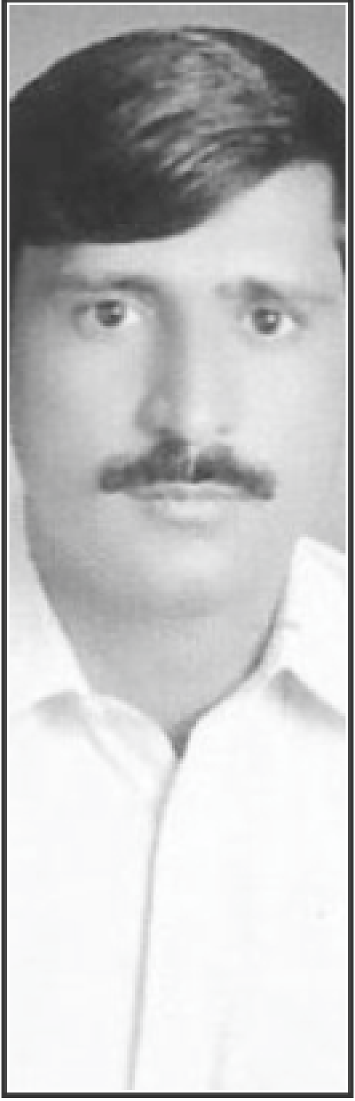

شہرِ نبی میں یارب جب میری حاضری ہو
چہرے پہ تازگی ہو، آنکھوں میں روشنی ہو

بس ایک آرزو ہے بس ایک جستجو ہے
بس آپ کا نگر ہو بس آپ کی گلی ہو

وہ لمحہ قیمتی ہے، وہ لمحہ جاوداں ہے
جب دل مچل رہا ہو جب آنکھوں میں نمی ہو

عشقِ شہِ زمن میں جو رات بھی گزاروں
اس کا ہر ایک لمحہ پھر کیوں نہ قیمتی ہو

مدحِ نبی میں جو بھی قرطاس پر اُتاروں
ہر لفظ مشکبو ہو ہر شعر دائمی ہو

اب تو یہی دعا ہے دنیا و آخرت میں
چشمِ کرم ہمیشہ ہم پر حضور کی ہو

اس کے علاوہ دانش کوئی نہیں ہے خواہش
صلِ علیٰ ہو لب پر جب وقت آخری ہو

اعجاز دانش

نعتؐ

نہ تھا شہ انبیا سے پہلے
عطا جو کرتا دعا سے پہلے

شہِ رسولاں کے تذکرے تھے
”وجودِ ارض و سما سے پہلے“

درود مطلوب ہے خدا کو
دعا کے بعد اور دعا سے پہلے

سنبھالتے ہیں، وہ روکتے ہیں
خطا کے بعد اور خطا سے پہلے

سہارا ہوں گے، سہارا ہیں وہ
قضا کے بعد اور قضا سے پہلے

وہ خلد جائیں گے بے محابا
سنا ہے سب انبیا سے پہلے

نوید ہر سُو ہی ظلمتیں تھیں
نبی کے عہدِ صفا سے پہلے

نوید عاجز

مناجات

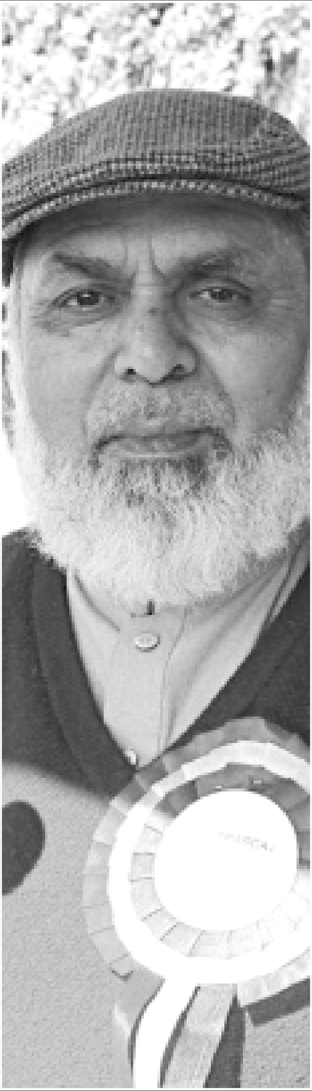

محمد انیس انصاری

حمد لکھنے کا قرینہ مجھے دے
اپنی توصیف میں جینا مجھے دے

موم کر دے مرا پتھر کا بدن
چشمِ نم دے ، دلِ بینا مجھے دے

اُمّتی مجھ کو بنانے والے
عشقِ سرکارِ مدینہؐ مجھے دے

تیری رحمت کے جزیروں میں ہیں
جو اُتارے ، وہ سفینہ مجھے دے

جو چھُپالیں مری بدصُورتیاں
وہ صدف دے ، وہ نگینہ مجھے دے

جو تری سمت رکھیں گرمِ سفر
وہی رستہ ، وہی زینہ مُجھے دے

جس میں بھانبڑ ہو ترا جانِ انیس
وہ سُلگتا ہوا سینہ مجھے دے

عقیدت

گوہر ہے خود میں اور خزانہ بھی ہے حسینؑ
اِک شخص ہی نہیں ہے زمانہ بھی ہے حسینؑ

موجود بھی ہے خیمۂ عزم و ثبات میں
اور کربلا کی سمت روانہ بھی ہے حسینؑ

سوچیں تو اُس کی ذات الگ ہے جہان سے
دیکھیں تو سب کے شانہ بہ شانہ بھی ہے حسینؑ

ہر دَور میں نشانِ عزیمت بھی ہے وہی
لیکن ہزیمتوں کا نشانہ بھی ہے حسینؑ

شامل ہر ایک ساعتِ عصرِ رواں میں بھی
دیکھیں تو ماورائے زمانہ بھی ہے حسینؑ

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

واقف حالوں کا ، گہرے رازوں کا
وہ واحد واقف ، سارے بھیدوں کا

حمدیہ سرگوشیاں

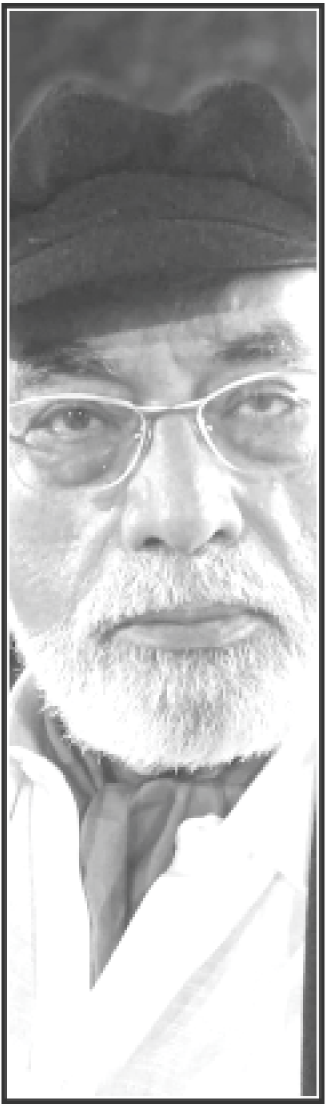

وہ چاہتا ہے، کہ پل پل بیاں کروں خود کو
سدا اسیرِ سماعت، گماں کروں خود کو

یہ جستہ جستہ فسانہ، ہے زندگی میری
مجھے گوارا نہیں، داستاں کروں خود کو

یہ بے سبب نہیں خاموش گفتگو تجھ سے
میں چاہتا ہوں، ترا رازداں کروں خود کو

یہ میرے ماتھے، جو روشن ہے، عشق کی آیت
پیام ہے، کہ سپُردِ ہفت خواں، کروں خود کو

لہو لہان مگر اپنے قول پہ قائم
دلِ شہید! ترا ہم اذاں کروں خود کو

وہ ایک سانس کی مہلت کبھی جو دے مجھ کو
میں بے نشانی سے، یک دم نشاں کروں خود کو

ہو تشنہ کام کوئی کیوں پکارنے والا
میں کیسے سامنے رہ کر، نہاں کروں خود کو

طارق بٹ

عقیدت

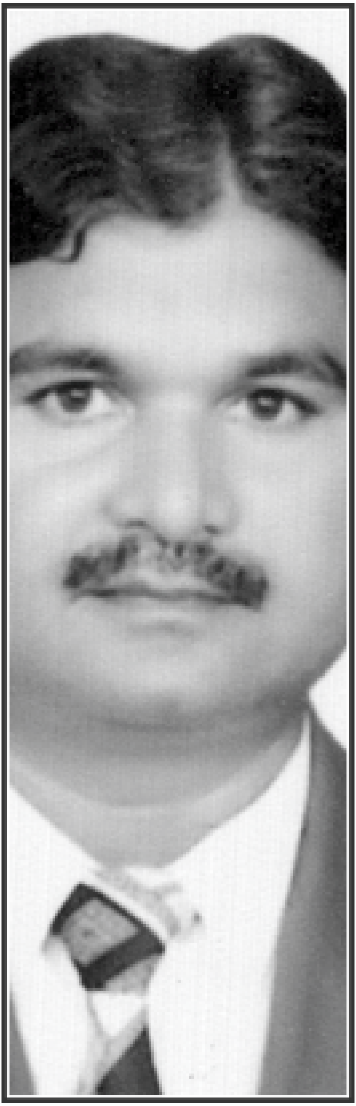

نور ہی نور تھا ، اُجالا تھا
غار تھا ، اور کملی والا تھا

شر پسندوں کو روکنے کے لئے
ایک مکڑی تھی ، ایک جالا تھا

تیرے خالق نے تیرے کاندھوں پر
دین و دنیا کا بوجھ ڈالا تھا

وہ نہ دارین میں کہیں کا رہا
تُو نے دل سے جسے نکالا تھا

بات کرنے کا ، درس دینے کا
تیرا انداز ہی نرالا تھا

تیرے اپنے تو تیرے اپنے تھے
تُو نے غیروں کو بھی سنبھالا تھا

اور کچھ تو نہ پاس تھا میرے
بس ترے ذکر کا حوالہ تھا

انصر حسن

عقیدت

نمود صلِ علی المصطفیٰ کا آئینہ
ہے نعت عشقِ شہہِ انبیا کا آئینہ

فروغِ دعوتِ خیرالانام کا مظہر
ہے نعت غلبۂ صدق و صفا کا آئینہ

متاعِ صلِ علیٰ ہے جہادِ نصرتِ حق
نبیؐ سے عہد، نبیؐ سے وفا کا آئینہ

رسولِ اُسوۂ قرآں کی سیرتِ احساں
ہے دل کے نور، خرد کی ضیا کا آئینہ

رسولِ داعیٔ ایماں کی حُجتِ فرقاں
ہے شر سے خیر کی حدِّ جُدا کا آئینہ

رسولِ ختمِ نبوت کا دامنِ رحمت
ہے ان کی رفعتِ بے انتہا کا آئینہ

وہ حرفِ عزتِ کعبہ وہ ربنا وابعث
ہے "یومِ مولدِ صدرُ العلیٰ" کا آئینہ

بشر پہ نعمتِ اقرا و ربک الاکرم
ہے نطقِ امی ام القریٰ کا آئینہ

جہانِ وحشتِ حرماں پہ لطفِ علم و قلم
ہے عہدِ "رونقِ بدرالدجیٰ" کا آئینہ

کیا ہے جن سے انا خاتم النبیین اخذ
ہے دین ان ہی کے حسنِ ادا کا آئینہ

رہے گا زیبِ نظر لا نبی بعدی سے
کوئی رسول نہیں آئے گا، کا آئینہ

وہ نور دیں گے مجھے خود کہ ہے مری امید
"نویدِ منزلِ شمس الضحیٰ" کا آئینہ

ہیں وہ مبشر و منذر، وہ اول و آخر
ہے اُن کی شان کرم ہر عطا کا آئینہ

ہے انبیاء پہ یقیں مصطفیٰ کے بعد یقیں
تھا اُن سے پہلے نبی جو بھی تھا، کا آئینہ

کسی بروزی و ظلی کا علم ہے نہ خبر
ہے صرف حُبِّ محمدؐ ولا کا آئینہ

رسولِ حق ہیں محمدؐ، انہی کی طاعت سے
عمل ہے علم کا، دیں تزکیہ کا آئینہ

بہ مدحِ ختمِ رسل ہے کہاں سخن آصف!
کوئی نہیں مرے محبوب سا، کا آئینہ

مرزا آصف رسول

عقیدت

کہتے ہیں تجھے سارے ، رحمان مرے مولا
کر دے مری مشکل کو آسان مرے مولا

تو کون و مکاں کا ہے سلطان مرے مولا
ہر چیز ترے زیرِ فرمان مرے مولا

ہوں جن و ملک چاہے انسان مرے مولا
سب پہ ہے ترا ہر دم احسان مرے مولا

محبوبؐ ترا ایسا ذیشان مرے مولا
جو ہے تری ہستی کی پہچان مرے مولا

دیتا ہے خبر ہم کو قرآن مرے مولا
ہے سب سے بڑی دولت ایمان مرے مولا

ہے میرا کھلا دشمن شیطان ، مرے مولا
کر میری حفاظت کا سامان مرے مولا

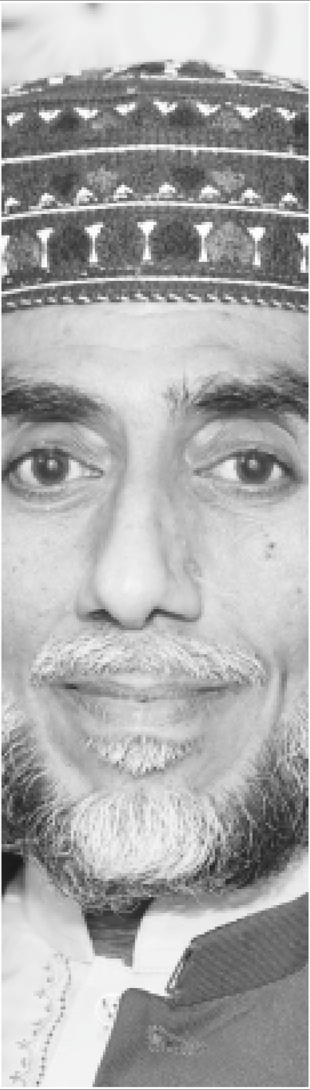

فیض رسول فیضان

رباعیات

ثنا خواجہ

خلوص و خیر عرفانِ محمدؐ
نیاز و ناز امکانِ محمدؐ
ثناء خواجہ چھوڑی یوں خدا پر
ہوئی ہے مرتبہ دانِ محمدؐ

صافی

کرو نقصان پورا ہو تلافی
اسی صورت ہی ممکن ہے معافی
مثال اس کی ہے جیسے زہر پی کر
لہو کو صاف کر دیتی ہے صافی

ہوا

طبیعت میں انا کب تک رہے گی
رعونت کی فضا کب تک رہے گی
کہو کس بات پر پھولے ہوئے ہو
غبارے میں ہوا کب تک رہے گی

تحمل

جہاں کہتا رہے اوباش مجھ کو
تحمل پر نہ دے شاباش مجھ کو
عطا رب کی ہے جیون پھر کہوں کیوں
جنم دیتی نہ ماں اے کاش مجھ کو

بات کھری

اگر مقصودِ شعر آدم گری ہو
نمایاں مقصدِ پیغمبری ہو
نہ ہو ماحول کا اس پر اثر کچھ
زباں پر بات سچی ہو کھری ہو

کرم کر

خداوندہ غریبوں پر کرم کر
زیادہ ہو گئے ہیں رنج کم کر
قیامت پر یقیں سب کا ہے لیکن
اسی دنیا کو ہی باغِ ارم کر

رسد

کسی درگاہ میں بیٹھے ہوئے ہیں
رسد کی چاہ میں بیٹھے ہوئے ہیں
کوئی مچھلی ادھر آئے گی کیسے
مگر مچھ راہ میں بیٹھے ہوئے ہیں

گلزار بخاری

رباعیات

اب دیپ ہے میرا نہ ہوا میری ہے
اس بستی میں حالت ہی جدا میری ہے
یہ خواب نہیں میرے مطابق میرے
اک شخص کے قبضے میں انا میری ہے

ان چاند ستاروں کی کہانی ہے جدا
حالات کے ماروں کی کہانی ہے جدا
دیوار کے سائے کو کہاں ہے معلوم
دریا کے کناروں کی کہانی ہے جدا

وحشت مری پہچان ہوئی جاتی ہے
اب زندگی آسان ہوئی جاتی ہے
عالم کے بکھیڑوں سے ملی مجھ کو نجات
فطرت مری مہمان ہوئی جاتی ہے

دکھ درد کے اظہار کا موقع نہ ملا
محبوب سے گفتار کا موقع نہ ملا
شاید کوئی صورت نکل آتی لیکن
دربان سے تکرار کا موقع نہ ملا

گلشن کی ہوا دیر سے مجھ تک پہنچی
پنچھی کی صدا دیر سے مجھ تک پہنچی
کھڑکی میں مری سوکھ چکے تھے سب پھول
ساون کی گھٹا دیر سے مجھ تک پہنچی

اطراف جو پاگل ہے ہوا، بھوکی ہے
باسی رہے ہم جس کے، فضا بھوکی ہے
اب بھاگ کے جائیں تو کدھر جائیں ہم
یہ دھرتی بھی مانندِ خلا بھوکی ہے

روتے ہیں کسی کام سے پہلے پہلے
اک رنج ہے آرام سے پہلے پہلے
یہ کون سی بستی ہے، ہر اک کھڑکی میں
جلتا ہے دیا شام سے پہلے پہلے

ٹوٹا ہوا اک خواب ہے دروازے پر
جلتا ہوا مہتاب ہے دروازے پر
بھٹکی ہوئی خاموش صداؤں کا یہاں
امڈا ہوا سیلاب ہے دروازے پر

سعید اشعر

رباعیات

آشفتہ بیانی کو جنم دیتے ہیں
کردار کہانی کو جنم دیتے ہیں
تصویر پہ کھلتے ہیں تخیل کے رنگ
الفاظ معانی کو جنم دیتے ہیں

خوش رہتے ہیں غم انتہا کی صورت
ہوتے ہیں درد بھی قبا کی صورت
ہے کرب کی صورت میں بلا کی تصویر
تصویرِ کرب ہے بلا کی صورت

پیمانہء خورشید کنول تھوڑی ہے
پتھر ہے نگینہء ازل تھوڑی ہے
آئینہ بنا ہے حسنِ دو عالم کا
کاشانہء دل تاج محل تھوڑی ہے

حریتِ افکار صنم میں رکھ دو
آزاد خدا قیدِ حرم میں رکھ دو
خورشید تراشو حرف کے تیشے سے
شعلے کی لپک دستِ قلم میں رکھ دو

اپنی آنکھیں خواب میں بو جاتے ہیں
جسم اوڑھ کر انتہا میں کھو جاتے ہیں
صورت وہ پہن لیتے ہیں اک دوسرے کی
دو دریا مل کر ایک ہو جاتے ہیں

ساحل سے سر پٹکتا ہے جوش میں بحر
ہے قطرہء پر جوش کی آغوش میں بحر
پر جوش ہے جامہء گہر میں قطرہ
ہے گوشِ قطرہء گہر پوش میں بحر

ہم سایہ نہ سائباں ہوا تھا میرا
تن ملبوسِ گماں ہوا تھا میرا
میں لا کے نقش میں پڑا تھا عریاں
پردہ بھی نہ درمیاں ہوا تھا میرا

محمد نصیر زندہ

قدرت جسے ہاتھوں میں قلم دیتی ہے
اس کو مہ و پرویں کا علم دیتی ہے
جب مردِ خدا کہتا ہے کن فیکون
فطرت نئے دور کو جنم دیتی ہے

نعتیہ رباعیات

محمد

م...... محمودِ الٰہی ہے کہ وہ کامل ہے
ح...... حامد ہے اسے حمد کا گُر حاصل ہے
م...... مسعود ہے ممدوحِ الٰہی ہو کر
د...... دارائی عالم کا وہی حامل ہے

اسرارِ الٰہی کا وہی اعلم ہے
اس کو ہے ولا علم سے اور محکم ہے
محصور رہا ٹھہرے، سکھا کر، اُس سے
وہ علم کا حامی ہے، وہی ہمدم ہے

احمد

ا۔ آمد سے تری ظلم کا اخراج ہوا
ح۔ حق پھیل گیا کفر یوں تاراج ہوا
م۔ مدعو کیے رب کی طرف فرماں روا
د۔ دعوت کا ادا حق جو ہوا آج ہوا

محبوب رکھو الفتِ محبوبِ خدا
مل جائے گی خود رحمتِ محبوبِ خدا
ممتاز ہے وہ دونوں جہانوں میں نوید
جس کو بھی ملی نسبتِ محبوبِ خدا

عاجز کو ہے تسلیم کہ ہے اس کی خطا
یہ سوچ رہا تھا کہ ملے کیسے بقا
ہاتف نے کہا جلد مدینے میں پہنچ
درکار ہے بس شافعِ محشر کی دعا

غم ہجر کا دنیا کو دکھانے سے رہے
جو تیری محبت میں زمانے سے رہے
رومی ہو کہ سلمان ہو یا ہو وہ بلال
یہ لوگ ترے شہر سے جانے سے رہے

جس جس نے سُنا اُن کے وہ حیران ہوا
عرفان خدا کا بہت آسان ہوا
لاریب کہ اک رشکِ ملائک ہے وہی
جو آدمی رحمان کی پہچان ہوا

اخلاص، وفا، خُلق، محبت کی ادا
تسلیم و رضا، رحم، سخاوت کی ادا
ہر ایک ادا پہلی سے بڑھ کر ہے تری
ہو عاصیوں کو دان شفاعت کی ادا

میں زندگی کا نام دوں یا جان کہوں
اک دل یہ کہے ہے کہ میں ایمان کہوں
یہ بزم سجائی گئی ہے اُن کے لیے
تخلیق جہاں کا انھیں عنوان کہوں

میں یادِ نبی میں تھا کہ الہام ہوا
ادیان کا ناسخ ہے یہ اسلام ہوا
اسلام کی دولت سے مشرف جو ہوے
اللہ کا خاص ان پہ ہے انعام ہوا

نوید عاجز

ہائیکو

کتنی صدیوں سے
بہتا پانی ہے ناراض
چھوٹی ندیوں سے !

....

ٹوٹے پھوٹے چہروں میں
اپنا آپ تلاش کروں
آئینے کی کرچوں میں !

....

غول پرندوں کے
نوحے پڑھتے رہتے ہیں
زندہ لوگوں کے !

....

بارش تھم جاتی ہے
گھر کی پرانی چھت پر
مٹی جم جاتی ہے

....

سرمئی شام کے دھندلکے میں
مَیں نے کتنا اُسے تلاش کیا!
ہر گئی شام کے دھندلکے میں

دریا میں طغیانی ہے
اپنی صورت ساحل نے
آج کہیں پہچانی ہے !

....

زندہ اور چلتے پھرتے
لوگ بھی اب تو لگتے ہیں
شہرِ خموشاں کے کتبے !

....

لوگ بھلا کب جان سکے
تیز برستی بارش میں
کس کے کتنے اشک بہے

نسیم سحر

دھرتی ماں

دھرتی ماں ہم تیرے بیٹے
سروں پہ اپنے کفن لپیٹے
ہر مشکل سر کر سکتے ہیں
دنیا بھر کی سب خوشیوں سے
تیرا دامن بھر سکتے ہیں
سورج چاند ستارے لا کر
ان قدموں میں دھر سکتے ہیں
تیری خاطر جی سکتے ہیں
تیری خاطر مر سکتے ہیں
پتھریلے سنگلاخ دلوں میں
امن کے پھول کھلا سکتے ہیں
جھرنوں کی مترنم لے پر
پیار کے گیت سنا سکتے ہیں
تند و تیز ہواؤں میں ہم
خون سے دیپ جلا سکتے ہیں
ہم تیرے شہدا کے وارث
ہم تیرے جانباز مجاہد
ہم تیرے پر عزم سپاہی
دریاؤں کی گود کے پالے
تیری عظمت کے رکھوالے
ہم اجلی صبحوں کے سورج
ہم راتوں کے نور اجالے
شبنم کے رخساروں جیسے
روشن چاند ستاروں جیسے
چاروں اور بہاروں جیسے
دھرتی کی پہچان بھی ہیں ہم
محنت کش دہقان بھی ہیں ہم
بستے نخلستان بھی ہیں ہم
جینے کا سامان بھی ہیں ہم
اک اٹھتا طوفان بھی ہیں ہم
اس پنجاب کی شان بھی ہیں ہم
سندھ بلوچستان بھی ہیں ہم
کے پی کے کی جان بھی ہیں ہم
گلگت بلتستان بھی ہیں ہم
اس مٹی کی آن بھی ہیں ہم
تیرا پاکستان بھی ہیں ہم
میرا پاکستان بھی ہیں ہم
تیری کھلی فضاؤں پہ ہم
تیری دھوپ اور چھاؤں پہ ہم
ہرگز آنچ نہ آنے دیں گے
تیرے بر اور بحر کی خاطر
ہر گاؤں ہر شہر کی خاطر
تیرے چاروں پہر کی خاطر
ہر دریا ہر نہر کی خاطر
ہم قربانی دے سکتے ہیں
ظلم کے آگے جبر کے آگے
جھک نہیں سکتے کٹ سکتے ہیں
طاقتور دشمن کے آگے
سینہ تان کے ڈٹ سکتے ہیں
دھرتی ماں ہم تیرے بیٹے
تیری گود میں پلنے والے
اس مٹی پر چلنے والے
تیری خاطر تیری خاطر
اس مٹی میں مل سکتے ہیں
پھر شاخوں پر کھل سکتے ہیں

مسعود احمد

ملی نغمہ

آنکھ کا تارا چاند ستارہ
اس دنیا میں سب سے بڑھ کر، قومی نشان ہمارا
پاکستان ہمارا .... پاکستان ہمارا

مر سکتے ہیں جھک نہیں سکتے، غیرت والے ہم ہیں
جس کو شک ہو لڑ کر دیکھے، ہمت والے ہم ہیں
جان وطن کی خاطر دینا، ہے ایمان ہمارا
پاکستان ہمارا .... پاکستان ہمارا

فوج ہماری جرات والی، لوگ دلیر ہمارے
مشکل وقت میں جم کر کھیلیں، سارے شیر ہمارے
ڈر کس بات کا اللہ سائیں، ہے نگہبان ہمارا
پاکستان ہمارا .... پاکستان ہمارا

دشمن بھی ڈرتے ہیں، ہم ہیں دھرتی کے رکھوالے
اک اک ذرے کی خاطر ہم، کٹنے مرنے والے
جنگ میں یہ تکبیر کا نعرہ، ہے سامان ہمارا
پاکستان ہمارا .... پاکستان ہمارا

مٹی اپنی آنکھ کا سرمہ، مٹی نور ہمارا
چوم لیں مٹی تو یہ کر دے، ہر دکھ دور ہمارا
مشکل ہر اک رستہ کر دے، گی آسان ہمارا
پاکستان ہمارا ... پاکستان ہمارا

اوج پہ رہتے ہیں ہم اکثر، اور کمال کے شاہیں
ہم اقبال کے مرد مومن، ہم اقبال کے شاہیں
دشمن بھی اقبال سروبہ، ہے حیران ہمارا
پاکستان ہمارا ... پاکستان ہمارا

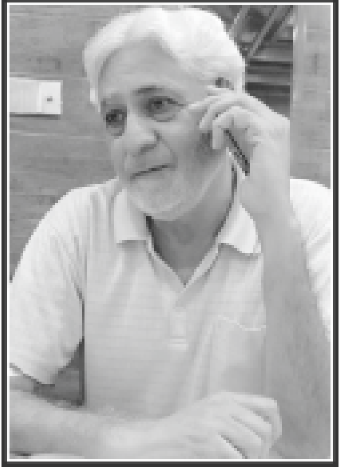

اقبال سروبہ

ملی نغمہ

مرے پاک وطن تُو سہاگ مرا
مرے جیون سُر کا راگ مرا

اُمید ہے قطبی تارا ہے تُو
فردوسِ بریں سے پیارا ہے تُو
سکھ چین ہے روشن بھاگ مرا
مرے پاک وطن تُو سہاگ مرا
مرے جیون سُر کا راگ مرا

....

مرا آنچل ہے سنگار ہے تُو
مرا مٹھڑا اک ، سنسار ہے تُو
تُو ہی مانگ ہے سر کا پاگ مرا
مرے پاک وطن تُو سہاگ مرا
مرے جیون سُر کا راگ مرا

....

ترا پرچم چاند ستارا ہے
دل جان کا لاڈ دُلارا ہے
مری آس ہے تُو، ہے تُو بھاگ مرا
مرے پاک وطن تُو سہاگ مرا
مرے جیون سُر کا راگ مرا

....

مری دل دھڑکن ، مری جان ہے تُو
مری ہر رُت کی پہچان ہے تُو
مرا خواب سجل ہے تُو لاگ مرا
مرے پاک وطن تُو سہاگ مرا
مرے جیون سُر کا راگ مرا

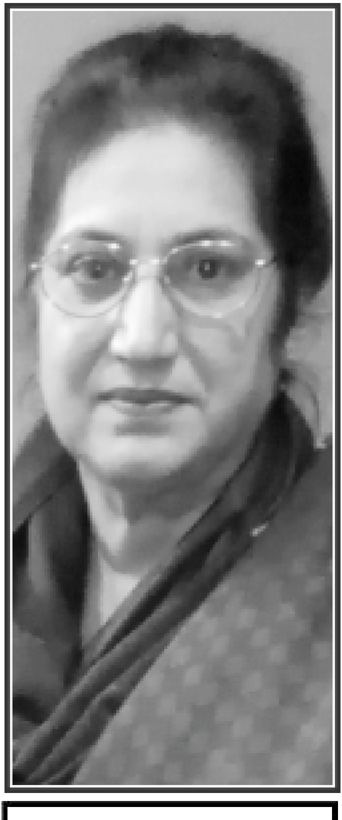

پروین سجل

غزل

کھلا مجھ پر درِ امکان رکھنا
مرے مولا، مجھے حیران رکھنا

یہی اک مرحلہ منزل نہ ٹھہرے
یہی اک مرحلہ آسان رکھنا

مرے دل کا ورق نکلے نہ سادہ
کوئی خواہش کوئی ارمان رکھنا

یہ دل طاقِ چراغِ زر نہ ٹھہرے
مرے مالک مجھے نادان رکھنا

مرے حالات مجھ کو چھو نہ پائیں
مجھے ہر حال میں انسان رکھنا

بھری رکھنا، مرے مولا، یہ آنکھیں
دکھوں کی بارشوں کا مان رکھنا

مرے ساتھی بھی مجھ سے بے نوا ہیں
بساطیں دیکھ کر تاوان رکھنا

یہ دن کیونکر چڑھا، وہ شب ڈھلی کیوں
مجھے آیا نہ اتنا دھیان رکھنا

مجھے بھی عام یا گمنام کر دے
کہ اِک آزار ہے پہچان رکھنا

اسیرِ عمر کو آیا نہ اب تک
کتابِ ہجر کا عنوان رکھنا

ہوا کی طرح صحرا سے گزر جا
سفر میں کیا سر و سامان رکھنا

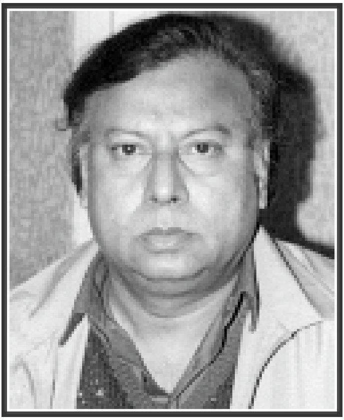

خالد احمد

غزل

خالد احمد

دُھوپ کی، ریت کی، تنہائی کی، ویرانی کی
ہم نے اِک عمر ترے غم کی نگہبانی کی

سایۂ دار اِدھر، سایۂ دیوار اُدھر
چھاؤں ڈھلتی ہی نہیں جرمِ تن آسانی کی

عشق کاغذ کو بھی دیمک کی طرح چاٹ گیا
خاک چھانے نہ ملی، دھاک سخن دانی کی

صبح سے، شامِ شفق رنگ کا رستہ پوچھا
راہ تکتی رہیں آنکھیں تری طغیانی کی

یہ کرم آپ کیا اہلِ رضا پہ، تُو نے
ہمیں زحمت ہی نہ دی سلسلہ جنبانی کی

ہم نے اِس سال بھی جی بھر کے نہ دیکھا تجھ کو
خالد اِس سال بھی ہم نے وہی نادانی کی

غزل

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے ، نیکیاں رہ گئیں

کس کی تعلیم کا ، آخری سال تھا
چوڑیاں بِک گئیں بالیاں رہ گئیں

عشق اک روپ تھا، حسن کی دھوپ کا
یاد کیوں دھوپ کی سختیاں رہ گئیں

خون میں گھل گئیں سانولی قربتیں
تن میں تپتی ہوئی ہڈیاں رہ گئیں

درد ، انگور کی بیل تھے ، پھل گئے
غم کشوں کے لیے تلخیاں رہ گئیں

عرصۂ فسق میں ، قسمتِ عشق میں
حکمت آمیز پسپائیاں رہ گئیں

قمقموں کی طرح قہقہے جل بجھے
میز پر چائے کی پیالیاں رہ گئیں

اس بلندی پہ ہم نے پڑاؤ کیا
جس کے آگے فقط پتیاں رہ گئیں

حسن کے ہاتھ سے آئینہ گر پڑا
فرشِ پندار پر کرچیاں رہ گئیں

ہم نے کاغذ کو بھی آئینہ کر دیا
لیکن اپنی سیہ بختیاں رہ گئیں

خالد احمد

غزل

ظاہر نہ کسی کور نظر پر بھی ہُوا میں
کیا فرق پڑا، تجھ پہ کُھلا، یا، نہ کُھلا میں

پتھر کی طرح اپنی جگہ سے نہ ہلا میں
شوریدہ سری کا ابھی لیتا تھا مزا میں

تتلی کے لیے کیا مرے اندر ہمک اُٹھا
اِس عمر میں بچوں کی طرح دوڑ پڑا میں

کس قدر کے پیروں میں نہ تھی جبر کی بیڑی
زندانِ اَنا میں بھی تھا زنجیر بہ پا میں

اِس مرحلۂ عمر پہ کیا تذکرۂ دل
پوچھیں گے وہ کیا مجھ سے' کہوں گا بھی تو کیا میں

برپا ہے وہ بزم اب مرے غم خانۂ جاں میں
پاتا نہ تھا جس بزم میں تِل دھرنے کی جا، میں

کیا کیا نہ وہ سہ سکا مرے سینے میں سمٹ کے
آوازۂ گریہ تھا وہ، دیوار رہا میں

یہ دل بھی اُسی کا تھا، یہ جاں بھی تھی اُسی کی
اِس راہ تک آتے ہی کہیں کا نہ رہا میں

کس کس کے لیے نام نہ داؤ پہ لگایا
کس کس کی ہتھیلی کی لکیروں میں بسا میں

اے رنج کشو ! رنج رُبا ! رنج گسارو!
'ساغر کو مرے ہاتھ سے لیتا کہ چلا میں'

اپنا نہ سکا، تیرے بتائے ہوئے رستے
لیکن ترے مانند کسی کا نہ ہوا میں

بھیگا ہوا لہجہ، وہ برستی ہوئی آنکھیں
اے ماں! ترے مرقد کی طرح بھول گیا میں

اِس دین پہ کیوں فخر سے میں سر نہ اُٹھاتا
اتنا ہے کہ اِس خاک پہ تن کر نہ چلا میں

یاروں نے پرِ کاہ کی تقدیس نہ جانی
سو خاک سے مانندِ گلِ کاہ اُٹھا میں

اک رندِ خراباتِ محبت تھا میں خالد
شاعر کسی عنوان، کسی طور نہ تھا میں

وہ لب تھے کہ برگِ گلِ گویائی تھے خالد
ٹھہرا، مگر اُس گل کے چٹکنے کی صدا میں

خالد مجھے منظور نہ تھا جاں سے گزرنا
گھر بیٹھ رہا باندھ کے پیمانِ وفا میں

خالد احمد

غزلیں

خالد احمد

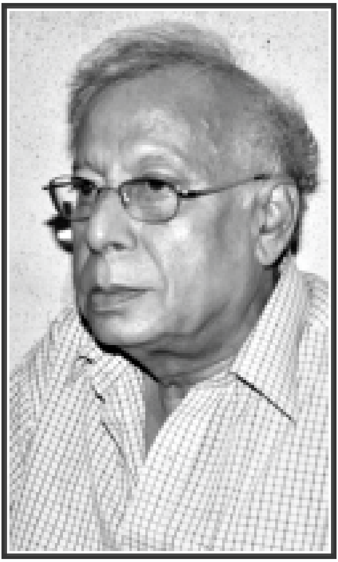

ترکِ تعلقات پہ رویا نہ تُو، نہ مَیں
لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تُو، نہ مَیں

نوحے فصیلِ ضبط سے اُونچے نہ ہو سکے
کُھل کر دیارِ سنگ میں رویا نہ تُو، نہ مَیں

حالات کے طلسم نے پتھرا دیا، مگر
بیتے سموں کی یاد میں کھویا نہ تُو، نہ مَیں

جب بھی نظر اُٹھی تو فلک کی طرف اُٹھی
برگشتہ آسمان سے گویا نہ تُو، نہ مَیں

ہر چند اختلاف کے پہلو ہزار تھے
وا کر سکا مگر لبِ گویا نہ تُو، نہ مَیں

بات سے بات نکلنے کے وسیلے نہ رہے
لب رسیلے نہ رہے، نین نشیلے نہ رہے

اشک برسے تو دروں خانۂ جاں سیل گیا
درد چمکا تو در و بام بھی گیلے نہ رہے

ٹیس اُٹھتی ہے مگر چیخ نہیں ہو پاتی
تیرے پھینکے ہوئے پتھر بھی نکیلے نہ رہے

پھول سے باس جُدا، فکر سے احساس جُدا
فرد سے ٹوٹ گئے فرد، قبیلے نہ رہے

موت نے چھین لیا، رنگ بھی نم بھی، خالد
آنکھ بھی سُوکھ گئی، ہونٹ بھی نیلے نہ رہے

غزل

شام تو ہم نے کر لی مگر
تجھ بن کیوں کر ہو گی سحر

بے قابو ہیں کیوں دھڑکنیں
دیکھ لیا کیا؟ اے چشمِ تر

کب تک در در دیں دستکیں
کب تک رہنا ہے دربدر

کچھ تو بتا اے آوارگی!
گھر جائیں گے کب لوٹ کر؟

تیرے گدا ہیں اہلِ رضا
جیسے گزری ، کر لی بسر

راہ تکیں گے ہم رات دن
تو بھی اٹھا کچھ رنجِ سفر

دل کی باتیں ، کب بارشیں
لکھ پائیں گی دیوار پر

بات ہدف تک پہنچے کوئی
کوئی سخن تو ہو کارگر

پیار کے پھول نہ مرجھائیں گے
ان کو دیا ہے خونِ جگر

راہ نما ہیں پھر آہٹیں
اے گمراہی ! چل دیکھ کر

وہ رت آئے گی ایک پل
دن دیکھیں گے ہم عمر بھر

سادہ کاغذ بانٹا کیسے
یوں بھی کی ہے عرضِ ہنر

خالد احمد

یہ خالی جگہ پُر نہ ہوگی

یہ خالی جگہ حشر تک پُر نہ ہوگی
لحد کے کنارے اِک انبوہِ دل دادگاں ہے
کدالیں، لحد سے پرے، محوِ آرام ہیں
خاک کی مٹھیاں آخری قرض ہیں
بیلچوں سے لحد پر چڑھائی گئی
چادرِ خاک کی سلوٹیں دُور کی جا رہی ہیں
کہ 'ہونا'، 'نہ ہونا' برابر کیا جا رہا ہے
مگر یہ خلا پُر نہ ہوگا
کہ 'ہونا'، 'نہ ہونا' کسی سے برابر نہ ہوں گے
کہ اپنا 'نہ ہونا' تو، ہونے سے پہلے بھی تھا
اب بھی ہے، کل بھی ہوگا
سروں پر تنے آسماں کی طرح
اپنا 'ہونا'، 'نہ ہونا' برابر برابر کھڑا ہے

ہتھیلی پہ کہسارِ ناہید کے
دامنِ سبز میں زندگی کی لکیریں رواں ہیں
مگر یہ لکیریں جہاں ٹوٹتی ہیں
وہاں اک نئی چمچماتی ہوئی لوح کا جگمگاتا ہوا تاج سر پر دھرے
ایک تازہ بہ تازہ گڑھا اپنی آغوش کھولے کھڑا ہے

مگر، دولتوں، دوستوں، شہرتوں، عورتوں کے دَروں سے گزرتی
لکیروں کی گنجان گہرائیوں میں چھپا، یہ گڑھا،

غور سے دیکھنے پر بھی ہم کو بجھائی نہ دے گا

لحد چادرِ گل تلے سو رہی ہے

تہِ گور، اِک غم سخن ہے

سرِ گور، انبوہِ غم زادگاں ہے

'سخن پروری' گنگ ہونٹوں کے مابین ربطِ رواں ہے

'سخن دوستی' اشتراکِ الم، اشتراکِ عمل، اشتراکِ فغاں ہے

'سخن' جھوٹ سچ کے میاں، ایک خطِ رواں ہے

تہِ گور، اِک گل سخن ہے

لحد چادرِ گل تلے سو رہی ہے

'یہ شاعر، کچھ ایسا ہی شاعر تھا

اِس کی لحد پر قیامت تلک گل کھلیں گے

'یہ لکھک ہماری زباں کا سرِ فخر تھا

آسماں حشر تک، صرف اس گورِ گل پوش پر شبنم افشاں رہے گا

'یہ لکھک ہماری سیاست کا آغاز گر تھا

'ہم اس کے سخن اور اس کی زبانِ سخن کے لیے

آخری سانس تک، آخری فرد تک

آخری شہر کے' آخری گھر تلک'

اک سپاہی کے مانند جم کر لڑیں گے'

'مرے دوستو! اب ہماری زباں بھی تحفظ طلب ہے

'یہ شاعر، ذرا نرم خو، نم نمو، نم سخن تھا

'مگر ہم 'سخن ور' نہیں ہیں

'ہمارے بدن سخت ہیں' ذہن فولاد ہیں

دل نہیں عزم آباد ہیں

دوستو! یاد رکھنا، ہماری محبت ہماری زباں ہے

سیاست گروں کی زبانیں کدالوں کے درجے پہ فائز ہوئی ہیں
سیاست گروں کی کدالیں رواں ہیں
وہ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں
وہ ہم سے لوگوں کا ہونا نہ ہونا برابر بنا دیں

ہماری رضا کو کھلونا بنا لیں
ہمیں پارہ پارہ کریں، خانہ خانہ ہمیں اور تقسیم کر دیں
ہمارے دُکھوں کی بھی تعمیم کر دیں
مفادات کی خندقیں زندہ لاشوں سے بھر دیں
ہمیں ایک کر دیں، ہمیں نیک کر دیں،
سیاست گرو! یاد رکھنا
زباں کی محبت، مفادات کا پالنا ہے
سیاست گری کے تضادات کا پالنا ہے
زباں دوستی اہلِ غم کے میاں، ایک خطِ گماں کھینچتا ہے
زباں پروری گنگ ہونٹوں کے رقبوں میں
جلتی جدائی کے تپتے ہوئے دشت میں
بغض کے خارداروں کے مرکز میں قائم شدہ تیرہ و تار
زیرِ زمیں تجربہ گاہ میں اِرتقا یافتہ بیج کا ڈالنا ہے!
زباں کی محبت لسانی فسادات کا پالنا ہے!
مرے دوستو! یاد رکھنا، وہ شاعر بہت نرم رُو، نرم خُو، نم نمو، نم نوا، نم سخن تھا
وہ اِس ملک کے گنگ ہونٹوں کی فریاد تھا!
اُس کا دل عشق تھا، حسن آباد تھا!

اُس کا اِک اِک سخن، ذرپئے ظلم و بے داد تھا!
اُس کا روئے سخن، سوئے اہلِ محن تھا!

'مرے دوستو! وہ کسانوں کی بے دخلیوں،
ہاریوں پر برستے ہوئے تازیانوں،
خوانین کی ظلم ایجادیوں!
اور سردار زادوں کی بے رحمیوں پر!
سخن رنگ زنجیر سے اپنا تن کوٹتا تھا!
مرے دوستو! اُس کے ہر لفظ سے، اُس کے اپنے بدن کا لہو پھوٹتا تھا!'
'وہ بے شک، ہماری زباں میں زباں کھولتا تھا
مگر اُس کے ہر لفظ میں، ایک دنیا کا دُکھ بولتا تھا
'مرے دوستو! یاد رکھنا، زباں کھولنا تو فقط
گنگ لب اہلِ غم کے لیے کھولنا!
گنگ ہونٹوں کے رقبوں میں
جلتی جدائی کے تپتے ہوئے دشت کی
دھول کے پھول کی زندگی کے لیے بولنا!
یاد رکھنا! گلِ گرد کی عمر، ہم شاعروں کے
تصور کے آفاق پر جھلملاتے ستاروں کی
کُل زندگی سے زیادہ رہی ہے!'
'مرے دوستو! یاد رکھنا، ہمارا سخن اُن کی آواز ہے
اور یہ گنگ لب، اہلِ غم، عشق آباد ہیں!

دوستو! یاد رکھنا، زبانِ محبت، ہماری زباں ہے!
'زبانِ محبت وہ خالی جگہ ہے
کہ ہم تم، کسی شہر بھی جا بسیں

کوئی دیسی، بدیسی زباں سیکھ لیں
یہ خلا، ہم، کسی بھی زباں سے
کبھی پُر نہیں کر سکیں گے!'

'یہ خالی جگہ' عشق ہے،
یہ خلا، حشر تک پُر نہ ہوگا!
'سیاست گروں کی کدالیں ہوا پھاڑتی ہیں،
'خلا کاٹتی ہیں،
'زمیں چاٹتی ہیں
'ہمیں بانٹتی ہیں
'مگر اِس سیاست کے میداں میں بھی اک گڑھا ہے
جسے اہلِ غم رات دن پاٹتے ہیں!
'یہ خالی جگہ، فسق ہے،
بے نواؤں سے یہ حشر تک پُر نہ ہوگی!
'ہمیں اہلِ غم کی ضرورت ہے اور آج ہم
ایک اور اہلِ غم کھو چکے ہیں!

یہ خالی جگہ، درد ہے،
یہ خلا حشر تک پُر نہ ہوگا!

خالد احمد

یہ ستارہ عروج دیکھے گا

سرو قد شام کا سڈول بدن
اوٹ سے ساحلی پہاڑی کے
ایک لمحے کو جھلملایا تھا
بال لہراتی، موتی بکھراتی
مرمریں پنڈلیاں جھٹکتے ہوئے
سرو قد شام ، سر بلند ہُوئی

زیبِ تن غُسل کا لباس کیے
آنچ پانی میں ٹمٹماتی رہی
کتنی آنکھوں میں جگمگاتی رہی
زیبِ تن کانچ کا لباس کیے
ٹوٹتی سانسوں ، ٹوٹتے قدموں
آنچ تارے کی سمت لوٹ گئی

سوز پر ساز کا قیاس کیے
وہ تہِ آب جھنجھناتی رہی
کتنے لہجوں میں سنسناتی رہی
ایک فانوس کی فصیلوں پر
رات بھر شام جھلملاتی رہی
کانچ کے گال تمتماتی رہی

شام کے ساتھ ایک تارا تھا
اوج پر ساحلی پہاڑی کے
یہ ستارا اُداس بیٹھا تھا
کوس ، ناقوس ، طبل ، نقارے
چاند ، تارے ، چراغ ، قندیلیں
رات خرگاہ میں فروکش تھی

نطق کی بھربھری چٹانوں پر
سنگ ریزے کریدتا تارا
حرفِ نَو آب کی تلاش میں تھا
صُبح کی شبنمی مسافت پر
دن کے لشکر کے اِس پڑاوٗ میں
اِک سپاہی تھا ، اِک الاوٗ تھا

اِس الاؤ کی نرم بھوبھل میں
رات تھی ، لفظ تھا ، ستارا تھا
کوئی نَو رنگ اِستعارا تھا

دیکھنا ، انگلیاں نہ جھلسا لے
سنگ ریزوں کی دھار کا مارا
یہ ستارا اِک استعارا ہے

سرو قد شام کا سڈول بدن
سطرِ نَو زیب کا جمال لیے
نظمِ نَو سال کی تلاش میں ہے

پست دل ، پست قد، نشیب نشیں
منجمد پانیوں کی پیاس ہیں ہم
بے لباسوں کے ہم لباس ہیں ہم

شام کے ساتھ ایک تارا تھا
عکسِ نَم بن کے اِس ستارے کا
ہم تہِ آب جھلملاتے ہیں

یہ ستارا عروج دیکھے گا
یہ ستاروں میں نام پائے گا
یہ خرامِ بُروج دیکھے گا

یہ خدائے سخن کا بیٹا ہے
نُور اِس روشنی کے دھارے کا
نظم کو راستہ دکھائے گا

نقدِ بے چوب کی صلیبوں پر
صُبح کی شبنمی مسافت تک
یہ ستارا بھی جھلملائے گا

مرغ کی بانگ کا خیال رہے
ہمیں ہر حال، ہر دھندلکے میں
ہر قدم ساتھ ساتھ رہتا ہے

نقدِ غم ، نقدِ یاس ، نقدِ سخن
کم عیاروں کا مال ہوتی ہے
بد نہادوں کی چال ہوتی ہے

خالد احمد

ساونی

کھِل اُٹھی ساونی، کنول کے گُنڈ
چھپی تال کی منڈیروں پر
جھاؤ کے جھاڑ، نرسلوں کے جُھنڈ
جھیل کی سُرمئی منڈیروں پر
نظم کی اَن کہی مُنڈیروں پر
زورِ پَر تولتی ابابیلیں
سطر کی اَن کھنچی مُنڈیروں پر
بندِ پَر کھولتی ابابیلیں

تیرتی ڈولتی ابابیلیں
دن کے خاکستری کناروں پر
رنگِ پَر گھولتی ابابیلیں
شام کے شبنمی کناروں پر
سوچ کے دلدلی کناروں پر
جھنڈ تھے، وِس بجھی کٹاروں کے
آنکھ کے آخری کناروں پر
گُنڈ تھے، نردئی ستاروں کے
دشمنِ جاں، اَلم مداروں کے
بستیاں چاٹنے نکل آئے

غول، غارت نشاں تتاروں کے
گردنیں کاٹنے نکل آئے
تال، تٹ، پاٹنے نکل آئے
کفش بردار چوب داروں پر
بھانڈ، گُر بھانٹنے نکل آئے
آتشِ اندام گُل عذاروں پر
بِس بجھی، نردئی کٹاروں پر
آب تھی، برق و باد و باراں کی
سرد و سرکش ہَوا کے دھاروں پر
خاک تھی، فکر کے بیاباں کی
اک قیامت تھی رات زنداں کی
جھیل کی تہ میں حشر برپا تھا
توڑ، دیوار، حجلۂ جاں کی
تال کے تٹ، سروج لیٹا تھا
رات، بادل بھی کُھل کے برسا تھا
ایک ماتم نشاں خموشی سے
چاند، بَن باس لے کے نکلا تھا
جاں گسل، جاں گراں خموشی سے
نیم لب، نیم جاں خموشی سے

تیرتی ، ڈولتی ابابیلیں

ایک شعلہ بہ جاں خوشی سے

زورِ پر تولتی ابابیلیں

بندِ پر کھولتی ابابیلیں

چاند کی چاپ سُن کے لوٹ گئیں

رنگِ پر گھولتی ابابیلیں

جھیل کے عکس چُن کے لوٹ گئیں

رُوپ دِکھلا کے گُن کے لوٹ گئیں

شبد ، لہریں ، سُگندھ ، ہلکورے

سربس اِک دُھن میں، دُھن کے لوٹ گئیں

لب بہ لب ، بند بند ، ہلکورے

گیت گت، چھند چھند ہلکورے

کیا دبے پاؤں نظم بڑھتی ہے

ہر نفس ہجر مند ہلکورے

دھوپ کی چھاؤں نظم بڑھتی ہے

ساوَنی بھاؤں نظم بڑھتی ہے

موہنی ، بھاونی مہک اُٹھی

ناؤ کے ناؤں نظم بڑھتی ہے

نظم کی ساوَنی مہک اُٹھی

یہ مہک ، سرحدیں نہیں رکھتی

یہ سخن گر ، حدیں نہیں رکھتی

خالد احمد

بشیر منذر کے لیے

ابھی پھول چُن رہے ہیں، ابھی انگلیاں لہو ہیں
ترے یار کار فرما سرِ قریۂ نمو ہیں

ابھی نذرِ غم بھریں گے، ترا ذکر بھی کریں گے
ابھی ہم پگھل رہے ہیں، ابھی ہم گراں گلو ہیں

ابھی کچھ نہ بن پڑے گا، وہ بس اِک دُن رن پڑے گا
ابھی ہچکیاں بندھی ہیں، ابھی دل لہو لہو ہیں

ترا غم غزل نہ ہوگا، کہ لہو میں حل نہ ہوگا
ابھی اس لہو میں تیرے سن و سالِ آرزو ہیں

ترے درد کیا کہیں گے، ترے رنج کیا کہیں گے
بہ کُلِ ظرف ریگ رُو ہے، بہ کُلِ حرف، کم نمو ہیں

ابھی نظم ڈھل رہی ہے، ابھی سطر چل رہی ہے
ابھی تارِ کارِ نقشیں، تہِ پنبۂ رفو ہیں

وہی نم نژاد آنکھیں، وہی ہجر زاد آنکھیں
وہی مے چھلک رہی ہے، وہی کوزہ و سبو ہیں

سبھی محفلیں جمی ہیں، سبھی گردشیں تھمی ہیں
کوئی ماتمی نہیں ہے، ترے یار سرخ رو ہیں

رہے یوں ہی تا قیامت، ترا فن کشیدہ قامت
کہ ترے سخن سے بڑھ کر ترے غم نیاز خو ہیں

ترے ہم جمال منذر، ترے ہم ملال منذر
ابھی فائزِ سخن ہیں، ابھی زیبِ گفتگو ہیں

خالد احمد

''خزانہ ہائے غمِ دہر کے فقیر'' (صابر ظفر کا پچاسواں شعری مجموعہ)

غزل اور نظم کی اپنی اپنی شناخت تو موجود ہے اور آئندہ بھی موجود رہے گی تاہم بیسویں صدی کے اوائل تک نقادوں نے دونوں اصناف میں جو امتیازات قائم کیے تھے ان میں سے وقت گزرنے کے ساتھ بہت سے فرق ناپید ہو چکے ہیں اور یہ دونوں اصناف کے مزاج و مندرجات کے ارتقائی سفر کا ثمر ہے۔ غزل طرحی مصرعوں کی مشقی میکانکیت اور افتراقِ معانی سے تخلیقی واردات کا احساس دلانے والی زیریں وحدت کی منزل میں داخل ہو چکی ہے اور نظم منطقی ربط و تسلسل کے تنظیمی وفہو المطلوبی مطالبوں سے آگے آپسی ٹکراؤ اور ایک دوسری کو کاٹتی اور ابھرتی ڈوبتی ہوئی لہروں کے فطری بہاؤ کے سانچے میں ڈھل چکی ہے۔ اور تخصیصِ مضمون کے اعتبار سے تو کسی فرق کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہ گئی۔ اس پہلو سے اقبال کی پورے اردو ادب کی عظیم تر شمار ہونے والی نظموں میں غزلیہ بندوں کا استعمال سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور مزید یہ کہ نظم کی الگ نوعی پہچان میں رکاوٹ سمجھے جانے والے ''غزل مرکز'' قافیہ و ردیف کی بے دخلی کے بعد بارِ دگر واپسی نے دونوں کی متحارب شدت کو کافی کم کر دیا ہے۔ ''زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد'' کے رویے کی بات دوسری ہے، ورنہ ناصر کاظمی کی ''پہلی بارش'' بارے بھی طے کرنا مشکل تھا اور ہے کہ اسے صنفی قطعیت میں طویل نظم سمجھا جائے یا صرف غزلوں مجموعہ ہی تصور کیا جائے۔ اس حوالے سے خواجہ سراؤں کی شخصیت اور زندگی کی کربناکیاں تصویرتی ''خزانہ ہائے غمِ دہر کے فقیر'' کی شعری قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ بے شک ایسے تخلیقی فلیش کو صابر ظفر کے جیسی عمر بھر کی فنی ریاضت ہی سنبھال اور معتبر شعری قالب میں ڈھال سکتی ہے۔ ان کی یہ کاوش غزلیہ ایپی سوڈز سے طویل نظمیہ ترتیب دینے کے کامیاب نمونوں میں شمار ہو گی۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہو عاشقانِ زمانہ کا فخر کیسے نصیب
نہ کوئی رانجھا ہیں ہم اور نہ کوئی ہیر ہیں ہم

ہستی کے اشتباہ سے معلوم ہم ہوئے
پیدا کہاں ہوئے وہیں معدوم ہم ہوئے

کیا افتخارِ ذات ہوا حاصلِ حیات
ناموسِ جسم و جاں سے تو محروم ہم ہوئے

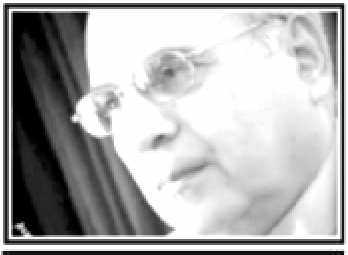

جلیل عالی

میں ہوں وہ ایک مورت آدم کی
جس کی مٹی نہ ٹھیک سے نم کی

نصیب چاکِ زن ہو نہیں سکا ہے سو اب
مرے وجود کو مردانگی کی حسرت ہے

چھپ کے دفنانے، شب، اپنوں کو اگر جاتے ہیں
درد کے کتنے اندھیروں سے گزر جاتے ہیں

ہماری موت کی تشہیر جب نہیں ہوتی
ہمارے واسطے پھر آہ و زاری کون کرے

ہمارے سانس ہوا پر دھرے جنازوں سے
ہماری زندگی خود زندگی نے کفنائی

گو اوج پہ جائیں ہم، سو روپ دکھائیں ہم
لیکن درِ دنیا پر تضحیک ضروری ہے

کسی طرح نہیں ہوتا ہے بارور مرا جسم
کسی طرح یہ کبھی معجزہ نہیں ہوتا

پتا چلا ہے مجھے بعد میں کہ میں نہیں میں
جو دل میں موجِ مسرت تھی ابتدائی گئی

ادھورا پن مرے پورے بدن پہ حاوی تھا
سو بے سبب تو مری خواہشوں کا خوں نہ ہوا

مجہول سا وجود تھا اور بے مہار تھا
دنیا سے، دیں سے، درد سے، رغبت نہیں ہوئی

توجہ چاہتا ہوں تالیاں بجاتا ہوا
جدھر ضمیر نہ چاہے ادھر بھی جاتا ہوا

میں ادھورا تو بعد میں ہوا ہوں
اوّل اوّل تو میں بھی تھا کُل سا

ہم کہ افسوس آدمی بھی نہیں
آدمی ہوں تو آدمی سے کہیں

وجود ڈھانپنے والے لباس تو ہیں بہت
عیوب جسم جو ڈھانپے وہ پیرہن ہے کہاں

شبِ سفر میں ہماری شناخت چھین گئی
کہیں گئے تو ہم ایسے کہ جیسے سائے گئے

حسنِ سلوک بھی نہیں بھاتا کسی کا اب
کیا بے نیاز داد و ستد کر دیا گیا

وہاں بھی ناچوں جہاں موت کا کنواں بھی ہو
کہ ہونا پڑتا ہے خوار و خجل حقیقت میں

ہم اک ادھوری سی اولادِ آدمِ خاکی
ہمارے ہونے میں کیا رمزِ آسمانی ہے

شروع سے ہی ہمارا وجود روندا گیا
یہ بے بسی کی کہانی بہت پرانی ہے

☆☆☆☆☆

آصف مرزا کا مجموعۂ کلام "صدا پانی کی"

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی تصویر اپنے منظر نامہ کی سیاحت پر مجبور کردیتی ہے، کوئی گیت یا ڈائیلاگ پوری فلم دیکھنے پر مائل کر دیتا ہے اور کوئی تحریر اپنے تخلیق کار کی جانب توجہ کھینچ لیتی ہے۔ کچھ ایسا ہی واقعہ مرزا غالب کے ساتھ بھی پیش آیا تھا جب کسی گلدستہ میں نسیم دہلوی کی ایک غزل اُن کی نظر سے گزری تو اُنھوں نے مرتب سے نسیم دہلوی کے حالات معلوم کیے حالاں کہ اُس وقت کی دلی چند کوس سے زیادہ پر محیط نہ رہی ہوگی لیکن حیرت ہے مرزا نوشہ کی نسیم دہلوی سے ملاقات محض ایک گلدستہ کے توسط سے ہُوئی! اِسی طرح کا اتفاق امجد اسلام امجد کے ساتھ بھی ہُوا جب اُنھیں آصف مرزا کا مجموعہ موصول ہُوا تو ٹائٹل کی غزل نے اُنھیں ایسا چونکایا کہ ساری کتاب کی ورق گردانی کرنا پڑ گئی۔ ایسا اُس وقت ہوتا ہے جب معروف لکھنے والے اپنے آپ میں اِس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ گرد و پیش پر اُن کی نظر کم پڑنے لگتی ہے۔ میر صاحب کی مثال سامنے کی ہے۔ جب وہ لکھنو وارد ہُوئے تو ایک رئیس نے اُن کے لیے ایک حویلی کا بندوبست کردیا۔ چند روز بعد وہ ملاقات کو گئے اور پوچھا کہ حضرت آپ کو پائیں باغ کا نظارہ کیسا لگا۔ میر حیران ہو کر پوچھنے لگے کہ وہ کہاں ہے۔ رئیس موصوف نے کھڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہُوئے کہا کہ اِس کی دُوسری جانب۔ تب میر صاحب کو معلوم ہُوا کہ اُن کے مطالعہ کے کمرہ کی کھڑکی پائیں باغ میں کھلتی ہے اور حویلی میں کوئی باغ بھی ہے!

بعض اشخاص اپنی درویشانہ طبیعت کے باعث نمود و نمائش سے دُور رہتے ہیں اور لوگوں کی نظروں میں نہیں آنے پاتے۔ پھر بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھیں اظہار کے وسائل ہی میسر نہیں آتے یا اِتنے کم میسر آتے ہیں کہ اُن کی موجودگی کا احساس اُن کے آس پاس رہنے والوں کو بھی نہیں ہونے پاتا۔

دیکھا جائے تو آصف مرزا کے معاملہ میں بھی اِن صورتوں کا تھوڑا تھوڑا دخل ضرور ہے۔

خاور اعجاز

درویش صفت تو وہ ہیں ہی، مری میں رہتے ہُوئے پہاڑوں سے کم ہی نیچے اُترتے ہیں۔ پی آر کے آدمی ہیں نہیں اور کام سے کام رکھتے ہیں اور وہ بھی واجبی سا تاہم اپنے تحریری اثاثہ کو مرتب و منظم کرتے رہنے کے علاوہ وہ اُسے اشاعتی مراحل سے بھی گزارتے رہتے ہیں۔ اِس تسلسل کا نتیجہ میں وہ کسی نہ کسی اچھا اسلام امجد کی نظر میں آجاتے ہیں اور پھر اُن کے کسی ٹائٹل کی غزل پوری کتاب کا مطالعہ کروالیتی ہے۔

مجھے اوّل اوّل اُن کے تصوف آمیز فلسفیانہ آہنگ نے متوجہ کیا تھا۔ وہ میرے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ میرے ہم عمر بھی ہیں اور ہم دونوں کی شاعری میں متذکرہ بالا عناصر کا مشترک ہونا بھی ایک وجہِ قربت ہے۔ اُن سے طویل ملاقاتیں تو نہیں ہو پائیں تاہم اُنھیں اپنی ہی طرح قانع مزاج پا کر یہ دلی اطمینان ضرور ہُوا کہ کھڑکی کھول کر پائیں باغ میں نہ جھانکنے والے میر صاحب کے بعد بھی موجود ہیں۔

آصف مرزا کی شاعری کا بیشتر رویہ تو اپنے عہد کے تلخ و شیریں بیان کرنے میں تقریباً وہی ہے جو اُن کے دیگر معاصرین کا ہے لیکن کچھ مقاماتِ آہ و فغاں کو چھوڑ کر بعض موضوعات میں (جو اگرچہ خال خال ہیں) اُنھوں نے جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جیسے:

کیسے بے روح مکاں اور مکیں ہونے لگے
سب کا باہر ہے لبالب مگر اندر خالی

اپنے زخموں کے جلو میں ہُوں بڑی راحت سے
تیری پُرسش کے نمکداں سے نکل آیا ہُوں

ہیں اس میں دن کے کچھ ٹکڑے بھی شامل
وگرنہ ہے مسلسل ایک ہی رات

....

ابھی مَیں نے اُن کے جس تصوف آمیز فلسفیانہ آہنگ کا ذکر کیا وہ اُن کے مجموعۂ کلام کے کئی اشعار میں رواں دواں مِلتا ہے لیکن مجھے یہ چند اشعار بطورِ خاص اچھے لگے ہیں:

آنا بھی خواب تھا مرا جانا بھی خواب تھا
دُنیا بھی خواب تھی یہ زمانہ بھی خواب تھا

کوئی آواز اُبھرتی نہیں بستی میں کہیں
ایسا لگتا ہے مکینوں سے ہُوئے گھر خالی

اَب ہے درپیش مجھے اپنے ہی اندر کا سکوت
اپنے اطراف کے طوفاں سے نکل آیا ہُوں

بہہ رہا ہے کوئی دریا مرے اندر شاید
یا کہیں دُور سے آتی ہے صدا پانی کی

کبھی جو آ گئی دیوار میرے رستے میں
دعا کو ہاتھ اُٹھاتے ہی در نکلنے لگا

ہم جو ہو جائیں کبھی واقفِ آدابِ سفر
آپ رستہ بنیں اور آپ ہی منزل ہو جائیں

....

ذرا سا بھی حساس شخص اپنے معاشرے کے نشیب و فراز سے غیر متعلق نہیں رہ سکتا۔ اُس

کا ردِعمل کم از کم روزمرہ کی باہمی گفتگو میں ضرور جھلکتا ہے۔ شعراء، ادباء، علما اور دیگر دانشوروں پر مشتمل صاحبانِ علم و دانش کا طبقہ عام لوگوں پر سبقت رکھتا ہے اور اُن سے نسبتاً زیادہ حساس ہونے کے ناطے بہتر ردِعمل کا مظاہرہ کرنے والوں میں شمار ہوتا ہے۔ ان میں بھی شعرا کرام کو دل میں اُتر جانے والے پیرایۂ اظہار کی وجہ سے فوقیت حاصل ہے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے آصف مرزا بھی اِسی کارواں کے فرد ہیں جن کے ہاں دن گذرنے کا احساس ہفت خواں گزرنے سے کم نہیں سو اس ہفت خواں کے گزرنے کے دوران آصف مرزا کن کیفیات سے دوچار ہوتے ہیں اُس کا عکس اُن کے درجِ ذیل اشعار میں بخوبی آگیا ہے:

وہی بساط بچھائی گئی ہے از سرِ نو
وہی ہیں زخم، وہی چارہ گر ہے بار دگر

یہ سب کہانی تو جیسے سُنی سُنائی ہے
وہی خبر ہے وہی نامہ بر ہے بار دگر

کیسے کم کوش ہیں یہ اہلِ زمیں
کچھ نہ بن پائیں تو خدا بن جائیں

میں کسی سمت جا نہیں سکتا
میرے چاروں طرف زمانہ ہے

اندھیروں نے بہت چاہا چھپانا
دیے نے سب کہانی کہہ سُنائی

دریا ایک ہی سمت کو بہتے جاتے تھے
لیکن سب کا اپنا اپنا رستہ تھا

مت پوچھ ہم سے قصۂ گم گشتگیء خیر
یہ مال اَب نہیں ہے ہماری دکان میں

....

غزلیات کے علاوہ منظومات کی ایک قابلِ لحاظ تعداد بھی مجموعہ میں شامل ہے جو اس بات کی مظہر ہے کہ شاعر محض اسیرِ گیسوئے غزل ہی نہیں بلکہ دیگر اصنافِ سخن میں بھی دسترس رکھتا ہے۔ وہ گنبدِ خضرا کے عقب میں افلاک سے اُترے ہوئے چاند ستاروں کا مشاہدہ کرتا ہے، خاکِ دیارِ مصطفیٰ سے اپنی پیشانی کو ضوفشاں کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے اور سرِ نوکِ سناں بلند ہونے والے سر کی تعظیم کو واجب خیال کرتا ہے۔ اکابرینِ اسلام کے ساتھ تخلیقِ پاکستان کے سرداروں کا بھی ممنونِ احسان نظر آتا ہے۔ ہنگامۂ دُنیا میں سرزمینِ فلسطین کے شہداُ کو بھول نہیں جاتا۔ سانحۂ پشاور کے ننھے جگر گوشوں کی یاد اُسے تڑپاتی ہے۔ اپنے ہم سخن دوستوں کے لیے لطیف جذبوں کا اظہار اُس کی قلم قبیلے کے باسیوں سے محبت کا ثبوت فراہم کرتا ہے غرضیکہ آصف مرزا کی منظومات میں متنوع موضوعات پر آرا، ردِعمل اور عقیدت واحترام کے ملے جُلے جذبات ملتے ہیں جو اُن کی دلچسپیوں کے دائرے، اُن کے مطالعہ کی وسعت اور قدرتِ اظہار کا ثبوت ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کے قلم کو مزید فیوض وبرکات سے نوازے (آمین)

☆☆☆☆☆

بجھتے دیئے سے پھوٹتی روشنی

یہ بات لسانیاتی اعتبار سے ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان سوچتا اپنی ماں بولی میں ہے۔ وہ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار جب کسی دوسری زبان میں کر رہا ہوتا ہے تو گویا داخلی سطح پر وہ بیک وقت ترجمے کے عمل سے بھی گزر رہا ہوتا ہے۔ یہ بات اِس امر کی دلیل ہے کہ ماں بولی انسان کے خون میں رچی بسی ہوتی ہے۔ ماں بولی کا لہو میں رچا بسا ہونا محض کچھ الفاظ و تراکیب اور محاورات و ضرب الامثال کا انسانی شعور اور لاشعور کے کونے کھدروں میں موجود ہونا نہیں بلکہ اُس ماں بولی کے پس منظر میں پھیلی ایک جیتی جاگتی اور زندہ ثقافت کسی کے شہرِ ذات میں سانس لے رہی ہوتی ہے۔ ایسی ثقافت جو فرد کی باطنی اور معروضی زندگی کو بامعنی بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔

ہر لکھنے والا چاہے کسی زبان کو بھی اظہارِ ذات کا ذریعہ بنائے، ماں بولی کا قرض اُس پر ہمیشہ واجب رہتا ہے۔ خوش نصیب اور بابرکت ہوتے ہیں ایسے لکھاری جو مستقل طور پر یا گاہے بگاہے ماں بولی کا یہ قرض اتارنے کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر خاور چودھری کا شمار ایسے ہی خوش نصیب اور بابرکت لکھاریوں میں ہوتا ہے جو اپنے خونِ جگر کو جلا کر اپنی ماں بولی سے محبت کے چراغ روشن کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر خاور چودھری کے چھاچھی کلام پر مشتمل مجموعے ”بجھتا ڈیوا“ کو یہ منفرد اعزاز حاصل ہے کہ ہندکو زبان کے معروف چھاچھی لہجے میں کی گئی شاعری کا یہ پہلا

نذر عابد

شعری مجموعہ ہے جو گندھارا ہندکو بورڈ پشاور کے زیرِ اہتمام شائع ہو کر 2023 میں منظرِ عام پر آیا۔ اس سے قبل مختلف شعرا چھاچھی ہندکو میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں اور اُن کا کلام رسائل و جرائد یا تاریخی تذکروں میں جا بجا چھپتا بھی رہا ہے لیکن چھاچھی ہندکو شاعری کا کتابی صورت میں اولین نقش ''بجھنا ڈیوا'' ہی قرار پاتا ہے۔ یوں اس کتاب کی ایک تاریخی حیثیت بھی بنتی ہے۔

''بجھنا ڈیوا'' کا تخلیق کار اپنی مٹی اور اس سے وابستہ ہر شے سے محبت کرنے والا ایک ایسا حساس شاعر ہے جس کی شاعری اپنی دھرتی، اپنی ثقافت اور اس سے جڑے اپنے لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی خوشیوں اور غموں کا ایسا دلنشیں اظہاریہ ہے جو پڑھنے والے کے قلب و روح پر ایک پھوار کی صورت برستا ہے۔ خاور چودھری کے باطن میں ایک ایسی قدیم روح آباد ہے جو اس کے پرکھوں پر گزرے گرم سرد زمانوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

جیسا کہ اس مضمون کی ابتدا میں مذکور ہوا کہ کوئی ماں بولی یا کوئی بھی زبان اپنے پس منظر میں مخصوص ثقافتی مظاہر کے لامتناہی سلسلوں کی امین ہوتی ہے۔ چھاچھی ہندکو کا لسانی پس منظر بھی ایسے ہی سلسلوں سے عبارت ہے۔

''بجھنا ڈیوا'' میں شامل لگ بھگ تمام نظموں میں چھاچھی ہندکو کے اس لسانی و ثقافتی پس منظر کی جھلکیاں بہت واضح انداز میں محسوس کی جاسکتی ہیں۔ خاور چودھری کے چھاچھی کلام پر مشتمل اس کتاب میں متعدد ایسی نظمیں شامل ہیں جو وادیٔ چھچھ کے مقامی ثقافتی رنگوں کو اجاگر کرتی ہیں۔ اس کتاب میں شامل ''موت جیا پہ''، ''ڈنگراں نی منڈی''، ''الکاں ناں میلہ''، ''ویاہے ناں کوٹھ''، ''گلی ڈنا''، ''چھپل'' اور ''گاہے نی رات'' ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعر نے چھچھ کی مقامی ثقافتی بوباس کو اس انداز میں سمو دیا ہے کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو اسی ثقافت کا ایک حصہ تصور کرنے لگتا ہے۔

خاور چودھری نے اپنی دھرتی سے جڑی سماجی زندگی میں خوشیوں اور غموں کے تمام تر رنگوں کو اپنے ثقافتی تناظر میں پیش کیا ہے۔ یہ ثقافتی منظرنامہ مقامی سطح کی سماجی روایات، معاشی سرگرمیوں، میلوں ٹھیلوں، کھیل کود اور تفریح کے جملہ عناصر سے ترتیب پاتا ہے:

اج کنڑکاں کپساں حشری تے
وت تھول وچاساں حشری تے

میں نچ نچ گاساں حشری تے
رل مل کے کھاساں حشری تے

اس نظم میں خاور نے اپنے علاقے میں ''حشر'' کے نام سے برپا کی جانے والی اُس دلکش ثقافتی مظہر کی تصویر کشی کی ہے جس کے تحت کاشت کاری کو اشتراکی سطح پر نظمِ اجتماعی کی ایک ایسی صورت میں ڈھال لیا گیا تھا جس میں کاشت کار زمینی ملکیت سے قطع نظر مل جل کر امدادِ باہمی کی بنیاد پر نہ صرف کھیتوں میں اجتماعی نوعیت کی محنت مشقت کرتے تھے بلکہ مل بیٹھ کر کھانے پینے اور اجتماعی تفریح کا سامان بھی کر لیتے تھے۔ یوں ایک اجتماعی نظام کے اندر رہتے ہوئے باہمی محبتوں کے فروغ کے ساتھ ساتھ سماجی سطح پر ایک گہری جڑت کا احساسِ تحفظ بھی برقرار رہتا تھا۔

خاور چودھری کو اپنی زرعی معاشرت سے وابستہ قدروں کا اس قدر گہرا شعور حاصل ہے کہ وہ کسی کی ذاتی زندگی میں پیش آنے والے دکھ سکھ کو بھی فصلوں کی بدلتی صورتوں سے تلازماتی انداز میں جوڑ دیتے ہیں:

وت کنڑکاں تے آیا سٹّا
ماہی ورھیاں توں نئیں ڈٹھا

کنڑکاں سٹّے لگ گئے خاور
مڑ نئیں آئے ونجھرے والے

....

خاور چودھری اپنے وسیب کی مثبت قدروں کو اپنی یادوں میں روشن کر کے ناسٹیلجیائی کیفیت سے بھی دوچار ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسی عظیم اقدار سے جڑے لوگوں کو ایسے اداس اور گمبھیر لہجے میں یاد کرتے ہیں کہ جس میں ان اقدار و روایات کی بحالی کی شدید خواہش بھی جھلکنے لگتی ہے لیکن بدقسمتی سے نفسانفسی کے اس دور میں ایسی روایات ماند پڑتی جا رہی ہیں۔

ڈب گئے پیڑی کڈنے والے
مار کے چھاں وچ سلنے والے

ٹر گئے جگری سنگی سچے
ننگی کنڈاں کجنے والے

....

خاور چودھری شعور کی بیداری کی اُس منزل پر ہیں کہ وہ سماج میں پائے جانے والے ایسے مُردہ کرداروں کو خوب پہچانتے ہیں جو مثبت اخلاقی و سماجی اقدار سے منہ پھیرے خالص اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہوئے بے فیض زندگی گزارتے ہیں۔ تاہم اپنی انسان دوستی کے تقاضوں کے پیشِ نظر ایسے کرداروں کی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے بھی وہ احساسِ مروت کے اسیر رہتے ہیں اور ''وہ اپنی خو نہ بدلیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں'' کے مصداق اپنی وضع داری

پر ثابت قدم رہتے ہیں۔

اوکھے ویلے جیہڑے کنڈ کرا ونجن
اینجیاں لوکاں نال پھرانڑ ناں فیدا کی

منگیاں نیں یارچ کھڑی کھڑی دساں
اپڑیں ٹھڈ توں چولا چاٹڑ ناں فیدا کی

....

ایسی صورت حال میں شاعر کا کسی قدر یاسیت کا شکار ہو جانا عین فطری عمل تصور کیا جا سکتا ہے۔ خاور چودھری کے ہاں ''بجھنا دیوا'' ایسی ہی مثبت تہذیبی قدروں کے ماند پڑ جانے کا استعاراتی اظہار ہے۔ تاہم زندگی کی مثبت قدروں اور ارتقائی رویوں پر یقین رکھنے والے ہر سچے تخلیق کار کی طرح خاور چودھری بھی کسی صورت امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان کے ہاں رجائیت سے بھرپور لہجہ اس بجھتے دیئے کے اُٹھتے دھوئیں سے پھوٹتی اس روشنی کو دریافت کر لیتا ہے جو شاہراہ زیست کی تاریکیوں کو منور کر دینے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔

کدی تے ساڈی قسمت ناں بی
ماریا جندرا آپ ای کھلسی

جلیٹھے ہاڑے ساڑھ مکایا
چیت نی ٹھنڈی وا بی کھلسی

شاعری کی یہی رجائیت جب اس کے لہو میں یقین بن کر دوڑنے لگتی ہے تو امید اور آس اس کے حواس پر یوں چھا جاتی ہے کہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اس کی سماعتوں میں سندر موسموں اور من موہنے قدموں کی آہٹیں رس گھولتی رہتی ہیں۔

دل ناں بوہا وجنا اے
ویکھیں کدرے او تے نئیں

....

ہر انسان اور ہر لکھنے والے کی اپنی کچھ عصبیتیں ہوتی ہیں۔ ان عصبیتوں کا تعلق اس کے مذہب، قوم قبیلے، زبان اور علاقے سے ہوتا ہے۔ اسی اصول کے تحت میں بھی اپنی کچھ عصبیتوں سے دامن چھڑا نہیں سکتا۔ خاور چودھری نے اپنی ایک نظم ''سوہنی تہرتی حضرو'' میں وادی چھچھ کے لگ بھگ اسی دیہات کا نام لے کر تذکرہ کیا ہے۔ چھچھ چوراسی کی رعایت سے مجھے نہیں معلوم کون سے چار دیہات کا تذکرہ ان سے کسی شعری، سماجی یا سیاسی مجبوری کے تحت چھوٹ گیا ہے لیکن اس نظم میں اگر میرے گاؤں کا تذکرہ نہ ہوتا تو شاید میں یہ مضمون نہ اتنی سہولت سے نہ لکھ پاتا۔

☆☆☆☆☆

......دوستوں کے درمیاں وجہ دوستی ہے تو......

اپنے عہد کے علاوہ کم سے کم اگلی دو نسلوں کو متاثر کرنے والے صاحب اُسلوب شاعر ناصر کاظمی کی لاجواب غزل کا خوب صورت مصرع:

دوستوں کے درمیاں وجہ دوستی ہے تُو

برادرعزیز علی رضا کی شخصیت پر ہر اعتبار سے پورا اُترتا ہے بیسویں صدی میں نوے کی دہائی اپنے اختتام کے قریب تھی جب ہماری شادی ساہیوال فرید ٹاؤن میں ہوئی بس یہی قدر ہم میں اور ناصر کاظمی میں مشترک تھی سب سے پہلے ہمیں یہ بات ہماری خوش دامن (مرحومہ) نے بتائی کیونکہ ناصر کاظمی کی اہلیہ محترمہ اُن کی پکی سہیلی تھیں۔

تب سے ہمارا آنا جانا ساہیوال میں ہونے لگا اب یہ اندازہ نہیں کہ سب سے پہلے علی رضا کے ساتھ کہاں ملاقات ہوئی...... پہلے ہم علی رضا کے ادبی ریڈار پر آئے یا علی رضا ہماری نظر میں آیا علی رضا تب شاید تھرڈ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا اور ساہیوال کے تاریخ ساز کالج گورنمنٹ کالج کا طالب علم تھا گمان غالب ہے کہ علی سے پہلی ملاقات فرید ٹاؤن ساہیوال میں ہی ہوئی علی رضا ہماری اہلیہ کے چھوٹے بھائی اعجاز نازش کا ہم جماعت تھا۔

پاکستان کے ادبی حلقوں میں کون ہے جو ساہیوال کی علمی و ادبی عظمت سے انحراف کر سکتا ہو یہ شہر جو جھنگ کے ہوتے ہوئے بھی شہرِ مجید امجد کے نام سے جانا جاتا ہے جن کی نظم کے زیرِ سایہ اردو ادب کا سارا دبستان سانس لے رہا ہے جس کی ہواؤں اور فضاؤں کے حُسن نئی نظم کا تاج سر پہ سجانے والے ڈاکٹر وحید احمد اپنی نظموں میں گاتے ہیں۔

علی رضا لڑکپن میں بھی ٹورسٹ گائیڈوں کی طرح شہر کا ادبی گائیڈ تھا جس کی وجہ سے ہمیں اس فکری، فنی، سماجی، معاشرتی اور ادبی روایتوں کے امین شہر سے شناسائی کا بھرپور موقع ملا......

علی رضا اور اس فراخ دل شہر کی محبت جس نے ہمیشہ ہمارے لیے بازو وا کیے دیکھنے والے جانتے ہیں ہمیں بازوؤں کے حلقے میں بھرنا کتنا

مسعود احمد

کٹھن کام ہے مگر علی رضا تو تب بھی بازوؤں کی زنجیر بنانے میں طاق تھا اس لیے ہم اس شہرِ دل ربا میں آنے کے بہانے ڈھونڈتے یہاں کی ادبی فضا میں اُڑتے پھرتے ٹھہرئیے مجھے پھر سے یاد کرنے دیں کہ علی سے پہلی ملاقات کہاں ہوئی اُن دنوں حبیب بینک سال میں ایک مرتبہ ملک بھر کے ممتاز نعت خوانوں کے درمیان نعت خوانی کا مقابلہ کروایا کرتا تھا ہم اس میں اکثر و بیشتر نظامت کے فرائض سرانجام دیتے..... علی رضا کی شہرت اُس وقت بھی نعت خوانی کے حوالے سے پورے پنجاب میں پھیلی ہوئی تھی شاید ہماری پہلی ملاقات وہیں ہوئی ہو جب علی نے اس مقابلے میں ساہیوال میں نمایاں پوزیشن حاصل کی علی کی عمر ان دنوں کوئی سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی ان دنوں نوجوانی اور جوانی میں تھکنے کا رواج ہی نہیں ہوتا تھا ہم کوئی علی رضا سے عشرہ بھر بڑے تھے مگر ہماری بڑھائی عمر تک ہی محدود تھی۔

ان دنوں بزرگ تو بزرگ فکری اور فنی طور پر نوجوانوں کے ادبی تیور ہمارے ہوش گم کرنے کے لیے کافی تھے۔ علی رضا نے ہمیں غزل اور مرثیے کے لاجواب شاعر نوجوان واصف سجاد سے ملوایا ماشاء اللہ آج کل صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج ساہیوال باکمال محقق، نقاد اور شاعر ڈاکٹر افتخار شفیع بھی ہمیں علی رضا کے توسط سے ملے اسی طرح سید ضیغم رضوی جو آج کل عدلیہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں مگر غزل سے وہ تب بھی بھرپور انصاف کرتے۔

آہ! غضنفر عباس سید جسے (مرحوم) لکھنا خود کو مارنے کے مترادف ہے ہم اور علی رضا نے دلوں کے دروازے پر دستک دینے والے اس شاعر کے کواڑوں پر کئی بار دستک دی علی رضا کے توسط سے جواں مرگ شہزاد انجم سے ملاقاتیں رہیں معروف وکیل اور شاعر افتخار شوکت جو شاید تب سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا سے بھی علی رضا نے ملوایا......اوصاف شیخ جیسے غزل گو سے ملنے کا سامان بھی علی رضا کے سبب سے ہوا۔ گویا آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ کچھ لوگوں کے بقول اس نئے پاکستان کو دیکھنے کے لیے علی رضا نے ہمارے لیے آنکھوں کا کام دیا اور ہمارے وجدان کے در کھولنے کے لیے یہ سارے رفیق کام آئے جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے اب چلیے پرانے پاکستان کی طرف جعفر شیرازی بے شک ہمارے سسرال کے بہت قریب کمپری ہنسو سکول کی راہ میں اردو روڈ بنا کر بیٹھے تھے اُن کے آستاں پر بھی ہم علی رضا کے ہمراہ ہی حاضر ہوئے...... پروفیسر اے ڈی نسیم صاحب کی زیارت کا موجب بھی علی رضا تھا کیا خوب صورت شخصیت تھی، کیا لہجہ، کیا کلام کیسی رس بھری گفتگو ہر ہوشیار پوری کے نیاز بھی علی رضا کی بدولت حاصل ہوئے سر سے پاؤں تک انکسار ہی انکسار اُن کی بیٹی کی غیر طبعی موت پر پُرسہ دینے کے لیے علی رضا کے کندھے کا سہارا لیا حاجی بشیر صاحب کے ہاں بھی علی ہی لے کر گیا۔

گرمیوں کی ایک سہ پہر ہم دونوں کو چہ گردی

میں مصروف تھے اچانک علی رضا کہنے لگا بھائی جان ناصر شہزاد آپ کو یاد کر رہے تھے ناصر شہزاد مرشد دلآویز ہندی دوہوں اور گیتوں کے لاجواب تخلیق کاریاروں کا کیا جاتا تھا ان کے در دولت کا رخ کرلیا مشن ہسپتال اور ہائی سٹریٹ کے درمیان محلہ اسلام آباد سے ملحقہ ایک کشادہ سڑک پر واقع ایک مکان کے دروازے پر علی رضا نے دستک دی ملازم باہر آیا بغیر پوچھے بتانے لگا "پیر ہوری کائی نئیں" ہم چلنے لگے تو علی نے ہمارا ہاتھ دباتے ہوئے ملازم سے کہا کہ پیر صاحب نوں آکھو ادکاڑہ توں مسعود صاحب آئے نیں...... ملازم پھر اندر گیا دو پرانی طرز کی کرسیاں اٹھا لایا علی تو خیر اطمینان سے ایک پر بیٹھ گیا ہم ڈرتے ڈرتے دوسری پر پھیل گئے پھر کرسیوں سے بھی کہنہ نسل کا پیڈسٹل لگا دیا گیا جس کے پر کم اور موٹر زیادہ چلتی تھی پھر ایک چارپائی کا اہتمام اور ہماری نشست کے بعد پانی کا چھڑکاو کیا گیا پھر ایک بڑی ساری کرسی اور تب سید ناصر شہزاد نمودار ہوئے آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ رنگ سفید قد درمیانے سے ذرا کم تو ند پشتینی پیروں جیسی بڑے تپاک سے ملے مریدوں کا تانتا بندھ گیا مگر سب کے سب پیر صاحب کے ساتھ ہمارے ہاتھ چوم کر زمین بوس ہوتے جاتے خالی چارپائی جوں کی توں خالی رہی پیر پرست معاشرے کی چھوٹی سی جھلک ہمیں دیکھنے کو ملی انہیں دنوں کئی دفعہ علی رضا کے گھر جانے کا اتفاق ہوتا علی کی امی سے کئی بار سر پہ پیار لیا ماں ماں ہی ہوتی ہے ممتا سے لبریز والدہ کیا ہوتی ہے علی کی اماں جیتی جاگتی مثال تھی بعض اوقات علی رضا کے والد صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوتا اتنی محبت سے ملتے ساری کلفت دور ہو جاتی یہی عالم علی رضا کے بھائیوں کا تھا گھر بے شک چھوٹا تھا مگر گھر کے افراد کا ظرف بہت بڑا تھا۔

نچلا بیٹھنا علی رضا نے کہا سیکھا تھا کالج کے بعد کبھی کوئی ادبی مصروفیت تو کبھی نعت خوانی کی محفل ان دنوں نہایت نفیس ادبی ذوق کے حامل سید متبسم گیلانی ایڈووکیٹ (مرحوم) ساہیوال شاید آفیسر کالونی میں رہتے تھے ناصر شہزاد کے داماد اور جدید لہجے کے (مرحوم) شاعر سید مراتب اختر کے بھتیجے تھے ہم اور علی رضا وہاں بھی حلقہ بگوشانِ مراتب اختر کے تحت ہونے والی نشستوں میں شریک ہوتے کیسی عمدہ نشستیں ہوا کرتی تھیں مجید امجد اکیڈمی میں جہاں واصف سجاد سے ملاقات ہوتی واصف لڑکپن میں ہی کمال کا شاعر اور شاید مجید امجد اکیڈمی کا سیکرٹری بھی تھا وہیں علی رضا نے پہلی بار سید شوکت ہاشمی جیسے عمدہ شاعر سے ملوایا افسوس..........

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

محرم الحرام میں اکثر علی رضا چوک حسینی میں شاید سید تہذیب الحسن زیدی کے ہاں محفلِ مسالمہ کا اہتمام کرتا جس میں شامل ہونے کی ہم اور احمد جلیل سعادت حاصل کرتے وہیں نعیم نقوی، کنور شفیق احمد، ایز دعزیز، علی وارث انصاری اور دیگر سے ملاقاتیں

ہوتیں جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں ساہیوال کے سارے بزرگ شعرا جعفر شیرازی، حاجی بشیر احمد بشیر، گوہر ہوشیار پوری، ڈاکٹر کاظم بخاری، شیخ امداد حسین (ابو سلمان رشدی)، نواب اکرم خان قمر، یاسین قدرت، راؤ محمود علی محمود، علی ارشد میر، ایم اے اشرف، حکیم شاہنواز انجم کے ساتھ علی رضا کا محبت اور احترام کا رشتہ تھا۔

چند برس قبل 82 کالونی ساہیوال میں حاجی بشیر احمد بشیر صاحب کی شاید برسی تھی اُن کی برسی پر حاجی صاحب کے فرزندِ ارجمند منیب سلطان نے اپنے ہاں ایک تقریب رکھی ہم بھی مدعو تھے وہاں ڈاکٹر خورشید رضوی اور ڈاکٹر مہدی حسن شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی بھی تشریف فرما تھے ہر دو اصحاب کا تعلق ساہیوال کی مردم خیز مٹی سے ہے وہاں ایک بزرگ فورٹ ولیم کالج سے لے کر جب تک کے ہمارے ادبی منظر نامے کا پوسٹ مارٹم کر رہے تھے ہمارا ان سے خوفزدہ ہونا بنتا تھا علی رضا نے ہمیں بتایا یہ خواجہ جعفر حسن ہیں ڈاکٹر مہدی حسن کے حقیقی چھوٹے بھائی اور خواجہ الطاف حسین حالی کے خانوادے سے ہیں ہم ان کے علمی رعب کے مارے دور جا بیٹھے وہ قرابت داری کے باوجود حالی پر بھی تنقید کے میزائل داغ رہے تھے ہم نے وہاں ان دنوں تازہ تازہ کہی نظم ہمارے عہد کا گوتم سنائی ہم سٹیج سے اُتر رہے تھے تو وہ تشریف لے آئے ہم سے نظم کا تقاضا کیا جو ہم نے ڈرتے ڈرتے اُن کے حوالے کر دی اگلے دن کے لیے ہمیں اور علی رضا کو انھوں نے اپنے گھر دعوت دی جو ہم نے قبول کر لی اور وہاں حاضر ہوئے جعفر حسن شاید فوج سے اعلیٰ عہدے سے ریٹائرڈ اور بہت وسیع المطالعہ ہیں اور ماشاللہ بقیدِ حیات ہیں پھر اُنھوں نے ہمارے عہد کا گوتم کا انگریزی ترجمہ بھی کیا۔

علی رضا گورنمنٹ کالج ساہیوال کے تاریخ ساز مجلے ''ساہیوال'' کے شعبہ اردو کا اپنے زمانہ طالب علمی میں ایڈیٹر بھی رہا شاعری میں کئی بین الکلیاتی مقابلوں میں ٹرافیاں اُٹھا کر ساہیوال کالج کے ماتھے پر جھومر کی طرح سجائیں...... نعت خوانی میں تو سکول کے زمانے سے ہی علی رضا کا نام بین الاقوامی شہرت اختیار کر چکا تھا ہماری ملاقات میں علی رضا کا شمار ٹین ایجرز میں کیا جا سکتا تھا۔

قد درمیانہ رنگت گوری جسم متناسب تہذیب اور شائستگی سے بھرا ہوا شعبہ انگریزی کے صدر پروفیسر سید علی اظہر نقوی، فارسی کے پروفیسر سید محمد اکبر شاہ اور شعبہ اردو کے پروفیسر سید ریاض حسین زیدی، پروفیسر میاں محمد مرغوب صاحب اور پنجابی کے پروفیسر علی ارشد میر یکساں طور پر علی رضا کے متاثرین میں سے تھے...... علی رضا کو ترقی کے لیے تعلقات کے زینے کبھی استعمال ہی نہیں کرنے آئے...... شوکت ہاشمی جب ساہیوال میں تھے یا پھر سید تجمل عباس جب ڈپٹی کمشنر تھے تو تب بھی اس نے کبھی کسی مفاد کے بارے نہیں سوچا حالانکہ بی اے کے بعد خاصی

معاملات کے تناظر میں اسے نوکری کی ضرورت تھی والد صاحب ریٹائر ہو چکے تھے۔
آخر بعد از کوششِ بسیار بینک میں نوکری کی مگر بینک کی نوکری اس کے مزاج سے لگا ہی کب کھاتی تھی ہم نے ساری عمر کسی سخن شناس کا بینک کی نوکری کرنا خود کو مصیبت میں ڈالنے والی بات ہے۔
سو یہ نوکری علی رضا نے زیادہ دیر نہیں کی اور آخرکار اُس نے خدا کے آسرے پر اس نوکری کو خیرباد کہا اور لاہور منتقل ہو گیا چھوٹی موٹی نوکریاں کیں......
لاہور آتے جاتے کبھی ہمارے ساتھ رک کر چائے کے کپ پر دکھ سکھ سانجھا کر لیتا ہم تو خیر گوتم بدھ جیسی تسلی دینے کے بھی اہل نہیں تھے۔
پھر ماں کی دعاؤں سے پی ٹی وی جوائن کر لیا آجکل ماشاء اللہ پی ٹی وی میں کرنٹ افیئرز کا پروڈیوسر ہے۔ ویسے تو ماں نام ہی محبت کا ہے ماں خیر و برکت کا سرچشمہ ہے علی رضا لاہور بھی ہوتا تو دل ماں کی محبت سے سرشار اور بے قرار رہتا۔ ماں علی رضا کے سر پہ سہرے کی خواہش لے کر اس جہاں سے رخصت ہو گئی زندگی کا سفر کسی عدالتی بلٹے سے نہیں رُکتا اسے چلانے والے کی مرضی جب تک چلائے......ایم اے اردو کو علی رضا کی ضرورت تھی سو اس نے یونیورسٹی کی یہ خواہش بھی پوری کر دی......
"ثنائے سرورؐ" "توصیفِ پیمبرؐ" اور "درود پڑھتے ہوئے" کے نام سے اردو نعتوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں "ثنائے سرورؐ" پر علی رضا کو قومی سیرت ایوارڈ بدست صدرِ پاکستان اور صوبائی سیرت ایوارڈ وزیرِ اعلیٰ پنجاب کے ہاتھوں مل چکا ہے۔
"توصیفِ پیمبرؐ" پر بھی علی رضا کو صوبائی سیرت ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔
"مکھاں دی مہکار مدینے" علی رضا کا پنجابی نعتیہ شعری مجموعہ ہے اور "مفہوم" کے نام سے غزلیات کا خوب صورت شعری مجموعہ اس کی سخن وری کا منہ بولتا ثبوت ہے اس کے علاوہ اُس نے غزلیات نعتوں اور سلاموں کے کئی انتخاب انتہائی محنت اور عرق ریزی سے شائع کیے۔
نعت گوئی میں جہاں علی رضا حضرت حسانؓ بن ثابت اور حفیظ تائب کی سنت کا پیروکار ہے وہاں اہلِ بیت کی محبت میں سرشاری کے عالم میں انیس و دبیر سے محسن نقوی اور شہاب صفدر جیسا آہنگ رکھتا ہے نعت خوانی میں اس کی لے نوازی اُسے ایوانِ صدر کے علاوہ خلیجی ممالک اور حجازِ مقدس تک کہاں کہاں نہیں لے گئی مدحتِ رسولؐ اور ثنا خوانیٔ رسولؐ کا منبر ہمیشہ سے علی رضا پر برکات نچھاور کرتا آ رہا ہے ان کامیابیوں اور کامرانیوں نے علی رضا کو مزید عاجز بنا دیا خود سے بڑوں سے جس محبت ادب احترام سے ملتا ہے اُسے دیکھتے ہوئے اس کی طبیعت اور تربیت پہ رشک آتا ہے۔
احباب رفیقاں اور اپنے ہم عصروں کے بارے میں نثر میں علی رضا نے جو لکھا ہے اس نثر پر نثار ہونے کو جی چاہتا ہے زندگی کا سفر رکتا نہیں جب تک روکنے والا نہیں روکتا ابھی علی رضا نے کتنے معرکے مزید سر کرنے ہیں یہ تو اُوپر والا ہی جانتا ہے ابھی تو خیر سے علی رضا منزلوں پہ منزلیں مار رہا ہے.........

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

شہزاد نیرؔ کی شاعری پر کچھ نثری گفتگو

میں اپنی تفریظی گفتگو کا آغاز اس سوال سے کرتا ہوں کہ کسی بھی شاعر یا نثر نگار کے قلمی کارناموں پر باقاعدہ تجزیاتی تبصرہ یا تنقید کا اہتمام کیا ہی کیوں جائے؟ موجودہ دور تک آتے آتے تنقید باقاعدہ ایک سائنس بن چکی ہے جس میں کئی پیچیدہ اور مشکل اصطلاحات بھی شامل ہو چکی ہیں۔ تاہم میری کوشش ہوگی کہ بغیر کسی گورکھ دھندے میں پڑے جس حد تک ممکن ہو معروضی گفتگو کروں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ ایک ناگزیر اور خودکار میکانکی عمل ہے جو صدیوں پہلے از خود وجود میں آیا۔ اور اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی معیاری تخلیق ایک مقناطیسی کشش رکھتی ہے، ایک سیلابی ریلے کی طرح ہوتی ہے جو اپنا رستہ خود بناتا چلا جاتا ہے۔ انسان چونکہ فطرتاً تجزیہ کار ہوتا ہے تو ہر شخص میں کوئی نہ کوئی ناقد / نقاد یا مبصر کسی نہ کسی صورت موجود ہوتا ہے۔ جب ایسے ہم خیال لوگوں کی نظر کسی شہ پارے پر پڑتی ہے تو سب اپنے اپنے رنگ میں اس پر بات چیت کے توسط سے اس فنی و فکری شہ پارے کا مطالعہ بھی کر لیتے ہیں اور ایک دوسرے کے ذہن و مزاج سے آشنائی کا سامان بھی بہم کر لیتے ہیں۔

رقص کو اعضا کی شاعری کہا جاتا ہے اور بالکل درست کہا جاتا ہے۔ چونکہ رقص کا تعلق موسیقی سے ہوتا ہے اس لیے شاعری، موسیقی اور رقص کے مابین ایک انوکھا ملاپ صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ اگر سادہ سی منطقِ استخراجیہ کا اطلاق کیا جائے تو شاعری کو الفاظ کا رقص کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس صنفِ ادب میں جو اتفاق سے تانیثی صیغے میں ہی برتی جاتی ہے، الفاظ شاعر کے خلاقی شعور کی ایک نادیدہ ڈور سے بندھے ہوتے ہیں اور شاعر اس ڈور کو ایک خاص ذہنی و روحانی عالمِ سرشاری میں، جسے میں لمحہ یوریکا کہتا ہوں، یوں ہلاتا ہے کہ الفاظ تراکیب اور صنائع کا پیراہن پہن کر بحر اور زمین کی تال پر ناچنے لگتے ہیں۔ اب جیسے

افتخار الحق

ایک کامیاب رقص کے لیے موسیقار اور ہدایتکار کا مشاق ہونا لازم ہے، بعینہٖ کامیاب، مقبول اور موثر شاعری کے لیے شاعر کی تخلیقی صلاحیت کا بھی ارفع ہونا لازم ہے اور اس کے پاس اظہار کا فن بھی اسی درجے کا ہونا مزید کڑی شرط ہے۔ اسے زیادہ سخت شرط میں اس لیے گردانتا ہوں کہ کئی شعرا کے پاس زرخیز ذہن کی زمین بھی ہوتی ہے اور تخیل میں بیج بھی اعلیٰ معیار کے، لیکن جو فصلِ سخن پک کر نکلتی ہے اسے دیکھ کر مرزا رفیع سودا کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:

طبیعت سے فرومایہ کی شعرِ تر نہیں ہوتا
جو آبِ چاہ کا قطرہ ہے وہ گوہر نہیں ہوتا

....

شہزاد نیر کی شاعری کا دیگر شعرا کی طرح بطور مبصر و نقاد مطالعہ کافی عرصہ پہلے شروع کیا اور وہ اس لیے نہیں کہ مرا مزاج لڑکپن سے ناقدانہ ہے بلکہ اس کی وجہ ان کے کلام کی پرکشش انفرادیت، بالکل جداگانہ اسلوب اور وہ جراتِ رندانہ ہے جسے محاورتاً تو ہم جابجا برتتے ہیں لیکن اگر اسے اس کی اصلی شکل اور رنگ و روپ میں دیکھنا ہو تو شہزاد نیر کا کوئی بھی شعری مجموعہ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔

بطور نقاد یہ میری ناکامی اور شہزاد نیر کی خوش بختی و کامیابی ہے کہ ڈھونڈے سے بھی ان کی شاعری میں بُنت، ندرتِ خیال، مضمون آفرینی اور عروضی قواعد سمیت مجال ہے جو کہیں سقم کی جھلک بھی دکھائی دے جائے۔ واضح رہے کہ یہ سب کچھ میں دیانتداری سے کہہ رہا ہوں اور اس میں مدح خوانی اور دوستانہ مروت کا عنصر عنقا سمجھا جائے ورنہ کمپنی کسی نقصان کی ذمے دار نہ ہوگی۔

شہزاد نیر کی شاعری پر گفتگو ان کے دو نمائندہ اشعار سے کروں گا جن میں آفاقیت کا عنصر بقول احمد ندیم قاسمی یوں چھلکا پڑتا ہے:

گو مرے دل کے زخم ذاتی ہیں
ان کی ٹیسیں تو کائناتی ہیں

....

پہلا شعر ان کے مجموعے "خوابشار" سے لیا گیا ہے۔ شعر پیش کرنے سے پہلے اس مجموعے کے عنوان پر بات کرنا زیادہ ضروری ہے۔ لفظ خوابشار ایک نیا لفظ ہے اور نولفظیاتی سلسلے یعنی neologism کی ایک کڑی ہے۔ نو لفظ سازی حضرتِ انسان کو دیگر مخلوقات پر فوقیت ملنے کے چند اوصاف و دلائل میں سے ایک ہے۔

ہبوطِ آدم جو تاریخِ انسان و عالم کا اہم ترین موضوع ہے، اس کا تذکرہ جب ہمیں قرآن کی سورہ البقرہ میں ملتا ہے تو آدم کو خلافت فی الارض کا مرتبہ ملنے کی سب سے بڑی وجہ "وعلم آدم الاسما" ہے یعنی "آدم کو علمِ اسما عطا کیا گیا"۔ عالمِ اسلام میں دستیاب تمام تفاسیر سے قطع نظر احقر کے خیال میں علمِ اسما سے مراد تخلیقی جوہر ہے۔ ہم کسی چیز کا نام

تبھی رکھتے ہیں جب ہم کوئی نئی چیز دریافت یا ایجاد کر لیں، جیسے صدیوں تک کتابی انسائیکلو پیڈیا استعمال کرتے کرتے جب برقیاتی وسیلۂ معلومات میسر ہوا تو وکی پیڈیا سامنے آ گیا۔ سو ظفر اقبال کے گلافتاب کی طرح شہزاد نیر نے اردو کو ایک خوب صورت نیا لفظ دیا: خوابشار جس میں خواب جیسے غیر مادی اور آبشار سے مادی لفظ یکجا کر دیے گئے ہیں۔ اتنے پرکشش امتزاج سے اتنا خوب صورت عنوان کا ظہور ہونا زبردست تخلیقی صلاحیت کی ٹھوس دلیل ہے۔ اس مجموعے کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

جا بجا خون کے چھینٹے ہیں ہمارے گھر میں
کون سا ورد کرائیں کہ بلائیں جائیں

....

اس شعر میں بظاہر تو صدیوں پرانے واہمے یا روایت کا ذکر کیا گیا ہے لیکن متن کی لفظی تہیں اتاریے تو نہ صرف ملکی اور مقامی سطح پر اس کا اطلاق نظر آئے گا بلکہ کوئی بھی حساس ذہن اس مضمون کی گونج آفاقی سطح پر بھی محسوس کیے بغیر نہ رہے گا۔ خون کے چھینٹے دنیا کے کس کس خطے کے گنوائے جائیں؟ کچھ تو پچھلے چند دنوں سے دو ممالک کی سرحد پر پوری دنیا کہیں خون اور کہیں خون آشامی کے آثار۔ وہ ادارہ جو بنیادی طور پر تیسری عالمی جنگ نہ ہونے کے لیے بنایا گیا تھا، وہ شاید صرف یہی مقصد پورا کر رہا ہے کیونکہ اسے ایشیا اور افریقہ کے جگہ جگہ رستے زخم اور ان بہتی خون کی پھوار شاید دکھائی ہی نہیں دیتی۔ دکھائی دیں تو یہ ادارہ کچھ دم درود کا رسمی انداز میں ہی اہتمام کرا لے۔

دوسرا شعر ایک مخمصے میں ڈالتا ہے کہ اسے طنز سمجھا جائے، سادہ سا سوال گردانا جائے یا تشکیکی عنصر میں ملفوف بیانیے کا درجہ دیا جائے؟

شہزاد نیر کے ایوارڈ یافتہ مجموعے "چاک سے اترے وجود" کی پہلی غزل کا یہ شعر کچھ یوں ہے:

چلتے پھرتے اسے بندش کا گماں تک نہ رہے
اس نے انسان کو اس درجہ کشادہ باندھا

....

یہاں کشادہ کے ساتھ باندھا کو برت کر شعر کی معنوی کشادگی کو لامحدود جہات کی طرف لے جانے میں شاعر مکمل طور پر کامیاب رہا ہے۔ متن اور ورائے متن دلچسپ معنویت کی ایک کائنات بنتی نظر آتی ہے اور لطف کی بات یہ کہ کسی بھی قسم کی مشکل، نامانوس اور پیچیدہ تراکیب وغیرہ کا سہارا لیے بغیر اس شعر کو فطری روانی کا شہکار بنا دیا گیا ہے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ متن کے غار میں کچھ مزید آگے جائیں تو دوسرے سرے پر جبر و قدر کا فلسفہ ایک مدھم سی روشنی دیتی مشعل اٹھائے قاری

کا منتظر ملے گا- یہ مشعل بجائے جواب دینے کے ایک اور سوالیہ پگڈنڈی کی طرف اشارہ کرے گی جو دو شاخے کی صورت قاری کو ٹھٹھک کر رکنے پر مجبور کر دے گی کیونکہ ایک شاخ پر قوت ارادی یا free will اور دوسری پر تقدیر یا predestination جلی حروف میں لکھا ہوگا- قاری ان میں سے جس پگڈنڈی پر بھی چلنا شروع کرے گا اسے جگہ جگہ ہر سنگِ میل پر لاانتہا یعنی infinity لکھا ہوا نظر آئے گا جو اس کے تجسس اور متن فہمی کے رشتے کو مضبوط تر کرتا جائے گا-

یوں ایک بڑے شاعر کا بڑا شعر تشکیل پاتا ہے جس کی کلید تفہیم گنجینۂ معنی کے طلسم کدے کا دروازہ کھولنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتی- اسی شعر کی معنوی توسیع غزل کا یہ جاندار اور شاندار مطلع کرتا ہے:

جب بھی چکّے سے نکلنے کا ارادہ باندھا
مجھ کو حالات نے پہلے سے زیادہ باندھا

....

یہ دونوں شعر نہ صرف اپنے اندر امر ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ شاعر اور اردو غزل کے تابناک مستقبل کے ضامن بھی ہیں-

شہزاد نیّر کی شاعری کا ایک نہایت اہم اور نازک پہلو جس نے ان کا مخصوص اسلوب تشکیل دینے میں بھرپور کردار ادا کیا، وہ تشکیک یا الوہیت سے ایسا طرزِ تخاطب ہے جو Divine Comedy , Paradise Lost اور اقبال کے شکوے سے ہوتے ہوئے اکیسویں صدی کے شہزاد نیّر تک چپکے چپکے چلا آتا ہے- اس پیچیدہ رنگ کو غالب کے اس شعر کے عدسے کے ذریعے زیادہ تفصیل سے دیکھنا ممکن ہوگا:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

....

شہزاد نیّر کے جداگانہ رنگ کو دیکھیے:

سخن کروں گا میں تجھ سے یہ کائنات ہٹا
تو میری بات کے رستے سے اپنی بات ہٹا

تمام کھیل کا انجام جانتا ہوں میں
یہاں بساط تو رکھ دے یہ جیت مات ہٹا

....

کائنات، اپنی بات، کھیل اقرار بساط جیسے عام سے استعاروں کی آڑ میں کتنے بڑے چیلنج کیے گئے ہیں اور وہ بھی کسے جو بقول فیض "ناظر بھی ہے منظر بھی-" چونکہ خالق نے انسان میں خود روح پھونکی ہے تو اپنی وہ صفات جو خاص اس سے منسوب نہیں ہیں، ان کی بہت معمولی سی مقدار اپنی اس خاص مخلوق میں منتقل کر دیں اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ انسان تخلیقی صلاحیتوں کی عمارت تجسس کی مضبوط بنیادوں پر ہی کھڑی کرتا ہے-

بنیاد رکھتے ہوئے اس کا فطری تجسس اسے پیہم "ھل من مزید" پر اکسائے رکھتا ہے اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے سوالات بیشتر شعری اور کبھی کبھار نثری پیرائے میں ظہور پذیر ہو کر ناقدانہ شعور کے حامل قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اوپر پیش کردہ شعروں میں جو لامکان سے گفتگو کرنے کی لیے مکانی رکاوٹوں کو ہٹانے کی فرمائش شہزاد نیر نے کی ہے وہ عصری اور گزشتہ شعرا کے انداز سے مسلمہ طور پر جداگانہ بھی ہے اور پرکشش بھی۔ یہ رنگ کچھ اور چوکھا ہوتا ہے جب ہماری نظر اس شعر پر پڑتی ہے اور ہم پر قرات کی چلمن سے انسان کے بنائے بیشمار مصنوعی خداؤں کی جھلک دکھائی دیتی ہے:

ہم ان کی خطاؤں پہ خداؤں سے لڑے ہیں
ایسے نہ ہمیں دیکھ خطاوار سمجھ کر

....

خدا کے لیے استعاراتی یا علامتی جمع کا صیغہ برتنے کے لیے حد درجہ مشاقی اور تخیل کے عمق کی ضرورت ہے بالکل ویسی ہی جیسی فیض نے یہ کہہ کر دکھائی:

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے
بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا

....

اور اس وقت کی شاعری کو یہی پختہ و منفرد اسلوب درکار ہے کیونکہ آج کا شاعر گزشتہ ادوار سے قطعی مختلف ماحول اور سماجی و تہذیبی کائنات میں جی رہے ہیں جہاں انسان کے بنائے ہوئے خداؤں کی نہ صرف ایک نئی تعریف متعین کرنا ضروری ہے بلکہ ان پر طنز کے کہیں زیادہ طاقتور تیر چلانے کی ضرورت ہے تاکہ جدید شاعری کا استعاراتی بیانیہ مضبوط تر، موثر تر اور پختہ تر ہو سکے۔ اللہ کا شکر ہے کہ شہزاد نیر معدودے شعرا کے اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔

اب ایک اور اہم پہلو پر بات ہو جائے۔ شہزاد نیر کا شمار ان چیدہ شعرا میں کیا جا سکتا ہے جن کی بابت یہ طے کرنا کارِ محال ہے کہ ان کی پہچان غزل ہے یا ان کی شاعرانہ قامت جانچنے کے لیے نظم کو شناختی نشان گردانا جائے کیونکہ انھوں نے دونوں کشتیوں میں قدم ایسے جمائے ہیں کہ کہیں بھی اپنا توازن برقرار رکھنے میں ناکام دکھائی نہیں دیتے۔ میں نے فیس بک کے معروف ترین فورم انحراف پر کچھ سال پہلے ان کی ایک زبردست نظم "ہدایتکار" پر ایک کامیاب مذاکرے کا اہتمام کیا تھا جسے آپ بآسانی بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ یہ نظم انکے نظمیہ مجموعے "گرہ کھلنے تک" میں سرِ فہرست ہے بھی اور ہونی بھی چاہیے۔ اس نظم کا سب سے نمایاں پہلو اس کی معنوی تہہ داری ہے جو عنوان سے لے کر اختتامی مصرعوں تک برقرار رہتی ہے۔ مجھے یہ نظم ن م راشد کی

نمائندہ نظم "زندگی سے ڈرتے ہو" کے اسلوب کی کہیں زیادہ ارتقائی شکل تھی گو کہ مضامین کے اعتبار سے کسی قسم کی مشابہت نہیں ہے۔ نظم "ہدایتکار" کا اختتامی حصہ ملاحظہ فرمایئے جو نظم کا نقطۂ عروج ہے:

تو بس اتنی غرض رکھو

کہاں آغاز تھا انجام کب ہوگا

تمھیں پوری کہانی سے کوئی مطلب؟

تمھیں تو جلد ہی میں مار ڈالوں گا

کہانی کار بھی میں ہوں

....

یہ نظم لکھ کر شاعر نے اپنے حصے کی تخلیقی مشقت پوری کر لی۔ اب قاری چاہے تو ایک قرات کے ساتھ ہی خراجِ تحسین کی صورت یکمشت اجرت دے دے یا بار بار قرات کا لطف بار بار لے اور ہر بار نئی تفہیمی چسکیاں لیتے ہوئے شاعر کو ترسیل و ابلاغ کا مشاہرہ دینے کا انتخاب کرے۔

اسی مجموعے کی ایک اور حیران کن نظم ہے "اساطیر"۔ نظم پر بات کرنے سے پہلے عرض کرتا چلوں کہ دراصل اس لفظ نے مجھے سدا اپنے طلسم میں جکڑے رکھا۔ سب سے پہلے شاید اس لفظ کو بطور ترکیب قرآنی آیتِ مبارکہ میں پڑھا تھا جہاں طرزِ کہن سے چمٹے کفارِ مکہ رسولِ کریم کی آئینِ نو کی تعلیمات کو اساطیر الاولین یا قدیم و فرسودہ کہانیاں کہہ کر رد کرتے رہتے تھے۔ تاہم تاریخ میں اساطیر کا مطلب عام طور پر قدیم تہذیبوں کی داستانیں لیا جاتا ہے۔ بابلی، مصری، عربی، فارسی، ہندی اور یونانی اساطیر میں غالباً آخر الذکر نے مختلف زبانوں کے ادب کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ اور صرف ادب کو ہی نہیں پورے کے پورے معاشروں اور اقوام کی اجتماعی فکر پر بھی گہرے نقوش ثبت کیے۔ آیئے دیکھیں شہزاد نیّر نے اس اہم موضوع کی نبض پر کیسے ہاتھ رکھا ہے:

یقین ناحق کے کور چشمو

یہ کن صحیفوں کی آیتیں ہیں

....

فلک کی شاہی کے نام پر تم بشر کو اپنا غلام کر لو

یہی سطور اساطیر کا عرق ہیں کیونکہ کارل مارکس نے مذہب کو افیون اس کے استحصالی ہتھیار کے طور پر برتنے کے لیے قرار دیا جبکہ فراز نے اپنے مخصوص رنگ میں مذہب کو اشرافیہ کی بالادستی قائم کرنے اور برقرار رکھنے کے معنوں میں یوں منظوم کیا:

امیرِ شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے

کبھی بحیلۂ مذہب کبھی بنامِ وطن

جبکہ اقبال نے کہا تھا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے۔

گزشتہ صدیوں کے ان تینوں صاحبانِ فکر کے مقابلے میں اکیسویں صدی کی نظم "اساطیر" اس لیے بالکل مختلف ہے کہ شاعر

نے استحصالی اشرافیہ کے طریقۂ واردات کی پرتیں کھول کر اس کا پورا مکروہ چہرہ بے نقاب کیا ہے:

خدائے واحد کے نام پر اس کی خلق تقسیم کر رہا ہے
غرور، مصنوعی رفعتوں کا
لبِ خطابت سے بانٹتا ہے

....

معاشی عدم توازن اور سماجی تفاوت پر شہزاد نیر کا نشترِ سخن ''ویلنٹائن ڈے'' نامی نظم میں کس جارحانہ مہارت سے چلا ہے، اس کا لطف ان سطور سے لیجیے:

اجنبی ہاتھ ترے ہاتھ سے خوشبو لے کر
اپنے پیاروں کی بہاروں میں چلے جاتے ہیں
چھوڑ کر یاس خزاں رنگ تری آنکھوں میں
جس کو پھولوں کے خریدار نہیں دیکھیں گے
تیرے چہرے سے نظر پھول پہ یوں کرتے ہیں
جیسے تو پھول نہیں
تیسرے درجے کی دنیا ہو کہ پہلی دنیا
زر کی تلوار وہی
مفلسی ایک طرح وار کیا کرتی ہے

....

نظم کا یہی حصہ اس ڈراما نما بیانیے کی معراج اور روح یعنی Quintessential component ہے کہ یہاں تک آتے آتے قاری پر شہزاد نیر کے سحر انگیز مصرعے پورا پورا اثر کر چکے ہوتے ہیں۔

معاشرے کی اجتماعی بے حسی جو معاشی عدم توازن کا چہرہ اتنا مسخ کرتی ہے کہ شہزاد نیر جیسے حساس شاعر کو مجبوراً ایک بظاہر مکروہ موضوع پر قلم اٹھانا پڑتا ہے اور نتیجتاً ''کفن چور'' نام سے ایک اور شہکار نظم اس معاشی مردے میں جان ڈالنے کی سعی کرتی ہے۔ کفن چور کی نفسیات شہزاد نیر نے جس طرح منظوم کی اس سے دوستوفسکی کے ناول Crime and Punishment کے مرکزی کردار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو قتل جیسا گھناؤنا جرم کرنے سے پہلے اس کا ہر ممکن جواز تلاشتا ہے اور پھر جرم کر گزرتا ہے۔ اسی طرح ساحر لدھیانوی کی نظم ''خودکشی سے پہلے'' میں بھی اس انوکھے جرم کے ارتکاب سے پہلے خودکشی کرنے والے شخص کی نفسیات بہت نزاکت سے پیش کی گئی ہے۔ تاہم شہزاد نیر نے اپنی معرکۃ الآرا نظم میں ایک طرف کفن چوری کے مرتکب اور دوسری جانب مردے سے بھی زیادہ بیجان سماج کی تحلیلِ نفسی اس طور کی ہے کہ قاری کیلئے فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ کس نے کسے مجبور کیا۔ میرے اس دعوے کی گواہی دل کے در پر دیوانہ وار دستک دیتے ہوئے یہ مصرعے دیں گے:

پردۂ خاک میں لپٹے ہوئے بے جان وجود
باعثِ تنگ زمیں ہوں، مگر اک بات بتا

جسم مٹی ہو تو کپڑوں کی ضرورت کیا ہے؟
دیکھ پیوندِ زمیں! میرے تنِ عریاں پر

داغِ افلاس کا پیوند-- اجازت دے دے
مر کے مرتے ہوئے انسان کو زندہ کر دے

....

یہ نظم پڑھ کر میں نے سکھ کا سانس اس لیے بھی لیا کہ شکر ہے شہزاد نیر کی خورد بین سے تیز نظروں نے ''تنِ مردہ کی عصمت دری'' یعنی Narcolepsy تک رسائی کر کے اس پر نظم نہیں لکھی گو کہ یہ میری خواہش بھی ہے کہ وہ اس سلگتے ہوئے موضوع پر نظم یا افسانچہ ضرور لکھیں۔

شہزاد نیرّ کی شاعری میں وارداتِ قلب، مظاہرِ لمس، معاملہ بندی، پھر وصال اور عاشقانہ تعامل کے عناصر کے ساتھ جمالیات کے جواہر بھی ہیں اور جمالیات کے موضوع پر میرے ایک مضمون میں اس کا تذکرہ بھی ہے۔ گو شہزاد نیرّ کی شاعری کی اس جہت پر بات کرنے کے لیے ایک الگ تحریر درکار ہو گی لیکن فی الوقت ایک نظم'' بدن کی حمایت میں'' پر مختصراً کچھ گزارشات پیش کرنے سے میرے تقریظی کلمات میں کچھ توازن پیدا ہو جائے گا۔ اس نظم میں بدن اور ورائے بدن دونوں جہانوں کا ایسا منظر نامہ ترتیب دیا گیا ہے جس سے قاری کی جمالیاتی تسکین قدرے انوکھے رنگ میں ہوتی ہے۔ نظم کا یہ اقتباس اقبال کے اس شعر کی اگلی منازل کی طرف ہمیں لے جاتا ہے:

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

....

ان اگلی اور زیادہ پر کیف منازل کی جھلک ملاحظہ کیجیے:

''آج تیرے لبوں سے بدن کا قصیدہ جو پھوٹا
مشیّت کے ٹانکے ادھڑنے لگے ہیں
ندامت کے پرزے بکھرنے لگے ہیں
اچنبھا! اچنبھا
لبِ تشنہ خو سے
بدن کی حمایت میں بھیگے ہوئے لفظ گرنے لگے ہیں''

....

احباب! شہزاد نیر کے مجموعے کوئی ضخیم قسم کے دیوان وغیرہ نہیں بلکہ کافی مناسب اور مختصر حجم پر مشتمل ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ ایسے مختصر مجموعوں میں مضامین کے تنوع کا اتنا بڑا جہان آباد ہے جس کی سیر کرتے ہوئے لگتا ہے الفاظ کی اڑن طشتری میں بیٹھ خیالات کی خلائے بیکراں میں ایک سے دوسری کہکشاں کا سفر ہو رہا ہے۔ امید ہے ان کے مزید مجموعوں سے تاریخِ ادب اردو مزین ہوتی رہے گی۔

☆☆☆☆☆

کتاب مایا (نظمیں) : شاعرہ گلناز کوثر

گداز اور لطیف نظمیں

اس جہانِ فانی میں سب "مایا" ہے امر ہے تو خالق کا نام، اس کا کُن، اسی کی چاہ۔

ہم تو صرف ہڈ بیتی یا جگ بیتی کہنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ ایسی ہی ایک باہمت شاعرہ کی کتاب "مایا" میرے ہاتھوں میں ہے۔ جو نظموں کی صورت اپنے من کی موج میں بہتی رہتی ہے۔ نظم کی روانی اور جذبوں کی فراوانی گلناز کوثر کی پہچان بنی ہے۔ وہ شہر لاہور کی گلیوں میں زندگی کے صبح و شام کو بہتر اور خوشحال بنانے کی کوشش میں نڈھال ہونے لگی تو بخت کی لکیروں میں پردیس کی لکیر ابھر کر سامنے آئی وہ نئے جہانوں کی تسخیر کو نکل پڑی۔ مشکل پسند عورت مشکلیں سہتی رہی جہد مسلسل نے اس کے لفظوں کو تاثیر دی وہ نظم کی شیدائی تھی پڑھتی رہی، سیکھتی رہی اور اپنے رنج والم نظم کرتی رہی۔

کتاب کا انتساب ان کے دوستوں کے نام ہے۔ یہ کتاب زندگی کے بہاؤ کی کہانی ہے۔ خوابوں کی اسیر گلناز کوثر کہتی ہے۔

مرے جی میں اک اور میں ہوں
جسے میں نے دیکھا نہیں ہے
مگر جب لرزتی ہوئی دھڑکنیں،
ڈوبتی سانسیں
ہارے ہوئے دن سنبھلتے ہیں
چپ چاپ بکھری ہوئی زندگی
اینٹ در اینٹ تعمیر ہوتی ہے
طوفاں پلٹتے ہیں

یہ طوفانوں کو پلٹنے پر مجبور کر دینے والی گلناز کوثر نے ذات و حیات کے غموں کو الاؤ بنایا جو جلن کے ساتھ ساتھ روشنی بھی اس کے وجود کی درزوں میں بھرتا رہا۔ اس الاؤ نے اس کمزور عورت کو توانائی دی بجھنے سے بچایا۔ وہ جدتوں کے ہمراہ جیتی ہے اور روایتوں میں گندھی کہانیاں نظم کرتی ہے۔

یہ نظمیں جو موہ مایا کے زیروزبر کو عیاں کر رہی ہیں اس کتاب سے پہلے بھی نظم ہو چکی ہیں تب جب آنکھوں میں خواب روشن تھے تو "خواب کی ہتھیلی پر" نظمیں بجی ہوئی تھیں آج جب زندگی کی سمجھ نے نڈھال کر دیا تو گلناز نے من میں پنپتی نظموں کو "مایا" کا نام دے دیا۔ کہتی ہیں:

زندگی ...... ہاں مگر
ایسی بیکار ہے
اس کی خالی ہتھیلی پہ جتنے خزانے دھرو

ثمینہ سید

پھیلے دامن میں جتنے بھی موتی بھرو
کچھ بھی رکتا نہیں

....

یہ نظمیں آگہی کا عذاب سہہ رہی ہیں۔ دکھوں کی بھٹی میں خوب پک چکی ہیں۔ آنکھوں میں چھب دکھاتی جوت کے ماند پڑنے سے پہلے رنج و محن کو نظم کے پلو میں گرہ کی صورت باندھ دیتی ہے۔ اور خود۔۔۔۔۔
ہاتھ جھاڑ کر نئی نظم کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔

نظم میں خیال کا تسلسل اور موضوع کی وسعت اسے دلکش بناتی ہے۔ نظم کی ہیئت میں بھی تنوع ہے یہ بحر اور اوزان کی پابند ہے تو دوسری طرف ان بندشوں سے آزاد ہو کر بھی شاعری کے حصار میں رہتی ہے ایسی نظم کہنے کو نثری نظم لیکن اس میں بات کہنے کی پوری آزادی ہے۔

اردو نظم کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ مذہبی اور صوفیانہ رنگ کی نظمیں آغاز کی نظمیں ہیں۔ قافیہ ردیف سے آزاد لیکن بحر اور وزن کی پابند نظم --- آزاد نظم کہلاتی ہے۔ پابند نظم میں ردیف قافیہ اور اوزان کی حدود ہیں لیکن موضوع اور نظم کے بند کتنے ہوں ایسی کوئی پابندی نہیں۔

ہم نظم کا ارتقا دیکھیں تو آغاز کی نظموں میں انگریزی انداز اور معاشرت کی نظم جھلکتی ہے جو شاید تراجم سے متاثر ہوئی۔ نظم نگار کی طبیعت میں ایک خاص ٹھہراؤ اور نغمگی آ جاتی ہے وہ نظم کی سطروں کی طرح اپنی زندگی کے پتھریلے راستوں پر چلتا جاتا ہے اور اپنے تجربات و مشاہدات کو نظم کرتا رہتا ہے۔

نظم کے وجود میں ایک مخصوص سحر ہے جس کا فسوں ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ نظم نگار ہزار ہا نظموں کے مطالعے سے لطف لیتا اپنی نظم کے سانچے میں اترتا ہے تو اپنی الگ شناخت بنا لیتا ہے۔ ایسے میں ہم دیکھتے ہیں نظم جب تسلسل سے لکھی جا رہی تھی تب تسلیم نہیں کی گئی اسے اپنی جگہ بنانے میں بہت وقت لگا۔ قلی قطب شاہ کی کلیات میں بہت سی نظمیں تھیں۔

جعفر زٹلی کے ہاں اردو نظم کے ابتدائی نمونے ہیں دیگر شعرا بھی لکھتے رہے۔ نظیر اکبر آبادی نے نظم کی پوری کلیات مرتب کر دی۔ جس میں زندگی کے موضوعات لیے گئے ہیں جو محبت سے معاملات زندگی تک پھیل گئی۔ روزمرہ کے مسئلے نظم ہونے لگے۔ یہی ہیئت آزاد اور پھر حالی تک آئی انھوں نے نظم نگاری کو ایک سازگار فضا دی۔ ان کے بعد کے شعرا نے نظم کو رواج دیا تراجم کی وجہ سے نظم میں انگریزی ادب کا رنگ در آیا۔

میر تقی میر نے بھی نظم نگاری کی ان کی نظم "گھر کا حال" ان کے گھر کی مفلسی عیاں کرتی ہے۔

علامہ اقبال کی نظم ایک پورا آب و تاب سے بھرا عہد ہے، انقلاب ہے۔ مجید امجد، فیض، ساحر، دلاور فگار، اختر شیرانی، سید ضمیر جعفری، احسان دانش سمیت بہت سے شعرا نے زندہ جاوید نظمیں جو مختصر بھی تھیں اور طویل بھی۔ میرا جی، ن م راشد، فہمیدہ ریاض، نسرین انجم بھٹی، پروین شاکر سے ہوتی ہوئی آج کے دور تک پہنچتی کچھ شکلیں بدلتی گئی۔ آج ہمارے اپنے وطن میں بہت سے نامور نظم نگار ہیں۔ میرے مشاہدے میں تو یہ آ رہا ہے کہ نظم تقریباً سبھی شعرا کے ہاں موجود ہے لیکن کچھ نام ایسے ہیں جنھیں سنتے ہی سماعتیں کسی اچھوتی نظم کی منتظر ہو جاتی ہیں۔ ان میں وحید

احمد، نصیر احمد ناصر، اعجاز رضوی، ثاقب ندیم، یونس خیال، پروین طاہر، فرحت عباس شاہ، مجھے تو امجد اسلام امجد، سلمان باسط، شاہین کاظمی اور عرفان صادق کی نظمیں بھی بہت بھاتی ہیں۔ بہت سے نام ایسے معتبر ہوں گے جو میں بھول رہی ہوں۔ گلناز کے اردگرد نظم نگاروں کا میلہ ہوتا ہے لیکن وہ منفرد نظم لکھ رہی ہے اور اپنے عہد کی نمایاں نظم نگار ہے۔

گلناز کوثر کی نظموں میں غموں کی کڑی دھوپ ہے تو مسرتوں کی مٹھی بھر ریت بھی آنکھوں کو چندھیا رہی ہے شفاف جھیلوں میں رڑک رہی ہے۔ وہ اپنے تھکن سے بوجھل چہرے سے زلفیں ہٹاتی ہوئی کہتی ہے۔

کھیل کھیل میں

یہ جو اجلی دھوپ چکن کر گھوم رہے ہو، کب
کھلنا تھی
لیکن ہم نے رات کی کالی مٹی گوندھی،
منتر پھونکا، آگ جلائی
ہنستے کھیلتے سورج کی اک شکل بنائی
بڑے جتن سے چرخہ جوڑا
کرنیں کاتیں،
جھلمل روشن دن کی یہ پوشاک بنائی
اور جو ہنسی کی جھاگ اڑائے پھرتے ہو، ممکن
ہی کب تھی، لیکن---
ہم نے سات جنم تک
جھرنوں، بارش، جھیلیں، سمندر،
بادل، بجلی اور گھٹاؤں کے قدموں میں پھول بچھائے
درد کی شاخ سے ٹوٹا گریہ
بہتے وقت کی خاک پہ دھر کے
دنیا کی اس آخری حد سے دور اڑایا
ٹم ٹم کرتے تاروں کی آنکھوں میں کچھ حیرانی بھر دی
اڑتے ہوئے پنچھی کو پریم کا گیت سکھایا
تھکے تھکے لمحوں کی خاطر نیند بنائی،
ریشم سینچ کے خواب اُگایا،
ایک تمہارا جی بہلانے کی چاہت میں
دیکھو ہم نے
کیسا کیسا کھیل جمایا۔

....

گلناز کی نظموں کے نام ہی اندر کی رمزوں کے عکاس ہیں۔ کرچیاں، روزن سیاہ، خود سے باہر، وہ یونان سے آئی، کیا وہ خواب مر گیا، ویئر ہاؤس، خود کلامی، لفظ رخصت ہوئے، ذرا سی حرارت ملے تو، پرواز، رات ٹھہری رہی، دل کے اندر اور اک دل مینٹل اسائلم میں، مراجعت، پرندے کچھ تو کہتے ہیں اور بنجارے مری آنکھیں لے جا--- بہت ہی شاندار نظمیں ہیں سطریں لمحوں کی صورت پھسلتی اور چہرے بناتی چلی جاتی ہے:

رستے میں ملی خواہش --- نظم

لوگ برفیلے، پتھریلے،
تپتے، ٹھٹھرتے ہوئے
راستوں پر سوالوں، جوابوں
حسابوں میں الجھے ہوئے
آگے بڑھتے رہیں
دوڑ کی چاہ میں دل کچلتے رہیں

....

گلناز کی نظمیں کبھی ڈوبتی ہیں تو مایوسی اور درد کی اتھاہ میں غرقاب ہونے لگتی ہیں لیکن اگلے ہی

پل وہ ابھرتی ہے اور امید کی روشن مشعل بن جاتی ہے۔ نسائیت سے بھرپور نظمیں محبت کی رگوں کو گدگداتی ہیں اپنا حصہ کشید کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتی ہیں۔ گلناز کے سنگ اس کی نظمیں بھی کبھی محبوب کے لیے سجتی سنورتی ہیں اور کبھی ٹوٹے بکھرے وجود کی راکھ مل کر چہرہ تک چھپا لیتی ہیں۔۔ الفاظ کراہتے ہیں:

خود سے باہر

تب پھر میں نے ایک ہی جست میں
اپنے بدن کو چھوڑ دیا تھا

یہ کل شام کی بات ہے
جب ان دیواروں کو گھورتے گھورتے
ساتواں دن بھی بیت چکا تھا
سات زمینیں، سات جہان یا......
سات جنم اور سات قبیلے
سب کچھ جیسے گڈمڈ ہو کر
سانس کی نوک پہ آن رکا تھا
دل کی گہرائی میں کوئی روتے روتے
دھیان کی گرہیں کھول رہا تھا
کومل نرم دھوئیں کی صورت
میں نے خود سے باہر آ کر
اپنے آپ کو دیکھ لیا تھا

گلناز خود کو ورجینیا وولف بن کر دریا کی لہروں کے سپرد کر دینا چاہتی ہے لیکن اس کے دوست، اس کے بچے اور زندگی کے روپہلے رنگ اس کی کلائی پکڑ کر واپس لے آتے ہیں۔

گلناز کوثر کا مطالعہ اور دنیا دیکھنے کا مشاہدہ اس کی نظموں میں ہنرکاری اور حوالے کی جہتیں اور پرتیں بھرتا ہے۔ وہ فہم کی سیڑھیوں پر چڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس نے تنہائی کو لباس بنا لیا ہے وہ اس کیفیت کے حصار میں مست ہے۔ تاثیر بھری آواز میری سماعتوں میں نظم ہو رہی ہے وہ کہہ رہی ہے:

دریا دریا ناؤ بڑھاتے منجارے
مری آنکھیں لے جا
بھیگے بھیگے جھونکے جہاں پر
سوئے گیت جگاتے ہیں
اور میٹھی رت لہروں سے ٹوٹتی سرگم
چنتی رہتی ہیں
میں تیری ہتھیلی پر رکھی آنکھوں سے دیکھوں
مست نشیلی ست رنگی دنیا کو
اک دنیا سے باہر

گلناز کوثر کی آنکھیں اور اس کے حواس تحیر کے اس در میں ایستادہ ہیں جہاں سے معطر نظمیں پھوٹتی ہیں۔ جن میں ہڈ بیتا ہجر و فراق ہے۔ کچوکے لگاتے دھوکے ہیں۔ ہمت ہارتے حوصلے ہیں لیکن اسے اب بھی وفاؤں کی چاہ ہے وہ انتظار میں رقص کرتی ہوئی گنگناتی نظم بن چکی ہے مجسم نظم۔۔۔ میں نے اس کو گلے لگا کر دیکھا ہے اس کے وجود سے محبت کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ یہ کرنیں نظم ہوتی رہیں گی جب میں اور گلناز نہیں ہوں گے تب بھی اس کی نظموں پر میری گواہی کی مہر لگی رہے گی۔ بہت دعائیں۔

☆☆☆☆☆

رفیق سندیلوی کی نظم ''کتنے یگوں سے خیمہ زن ہوں'' کا شعریاتی و اکتشافی تناظر

قدیمی آدمی ہوں مَیں پسِ تاریخ کا
کتنے یگوں سے خیمہ زن ہوں
خاکدانِ غیر پر
کھوئی ہوئی تجلیل کا ماتم کناں ہوں
رازداں ہوں
اُس ہزیمت کا
جو میری خاک کو ذرہ بہ ذرہ جمع کرتی ہے
مجھے للکارتی ہے
مَیں بدل جاتا ہوں
ڈھل جاتا ہوں
آتش میں
ہوا مجھ کو اُڑا کر منقلب کرتی ہے
میری جلد سے خوشبو
مری کِینچلی اُترتی ہے
مری تقویم میں
اکھوے نکلتے ہیں نئے امکان کے
وحشت کے گھیرے میں
نُمو پاتی ہے تنہائی
تسلسل کے اندھیرے میں
ابد کی پھلجھڑیاں کُھلتی ہیں
پورے جسم میں
نادیدہ و دیدہ زماں آپس میں ملتے ہیں
کشش پانی کی
صحراؤں کی جانب کھینچتی ہے
باغ اُگ آتے ہیں
کیچڑ میں ستارے
شبد کی ٹہنی پہ کھلتے ہیں
تجلی مسکراتی ہے
مَیں جولاں گاہِ باطن سے اُبھرتا ہوں
تو لگتا ہے
کمانِ کائناتِ ہست میں
سب تیر میری سانس کے ہیں
یہ مکان و لامکاں
مشاطگی کرتے ہیں میرے حُسن کی
بادِ صبا جُھولا جُھلاتی ہے
مرے کینڈے میں آجاتے ہیں مفتوحہ علاقے
پوچھتے کیا ہو
ہزاروں سال کی آوارگی ہوں

سید تحسین گیلانی

وقت کا متروک آسن ہُوں
قدیمی آدمی ہُوں مَیں پسِ تاریخ کا
کتنے یُگوں سے خیمہ زن ہُوں
خاکدانِ غیر پر!

اس نظم کے تخلیقی عمل کے نشیب و فراز میں شاعر کے وہبی میلان اور تخلیقی اُپج کے بے پناہ مظاہرے کو نشان زد کرنے کے لیے اس نظم کے اندر جھانکنا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ریاضت و تربیت کا عمل وہبی میلان کو جلا بخش سکتا ہے؟ شاید وہ اسے جلا تو بخش سکتا ہے لیکن اُسے جنم دینے سے قاصر رہے گا۔ میرا خیال ہے ماحول کی سازگار ہونا ضروری ہے۔ ناسازگار ماحول میں تخلیق کار اپنی تخلیقی اُپج کو بروئے کار لانے سے معذور رہے گا اور اگر تربیت و ریاضت کے عمل سے ہی محروم رہ جائے تو قیاس غالب ہے اس کے اندر چھپی تخلیقی نظام ہی جامد یا زنگ آلود ہو جائے لیکن یہاں سب اچھا ہوا ہے۔ یہ نظم معنوی لحاظ سے پرت در پرت ارتقا اور اس کی mutation یعنی تقلیب پر گفتگو ہے یا جین Gene میں کسی تبدیلی یا کسی ایسے محرک کی جانب متوجہ کرتی ہے جو کائناتی نظام جوہر یعنی essence کی اہمیت کے ساتھ لاشعوری سطح پر existence کو اولیت دیتی ہے:

"مجھے للکارتی ہے
میں بدل جاتا ہوں
ڈھل جاتا ہوں آتش میں۔۔"

یہاں تخلیق کار کسی جذباتی دھچکے، کسی تناؤ، کسی لمحے کے تموّج کی وجہ سے باطن کی تہہ میں منفعل عناصر (جو قدرتی طور پر مادری ہیں) کو مَس کرتا ہے لیکن سطحِ خیال پر تیرتے ہوئے فعال عناصر (جو مزاجاً پدری ہیں) سے متصادم ہے۔ اصل میں وجود کی ثنویت اور اس کے بوجھل پن سے گزرتے ہوئے تخلیق کار Chaos یعنی زاج کے طوفان سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اس نظم میں خیال یا وژن روشنی اور آزادی کی نوید بن کر اس کے ذہنی افق پر نمودار تو ہو چکا ہے لیکن مسلسل سوالیہ کیفیت سے دوچار ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ نظم نگار بطور شاعر بیک وقت فنکار بھی ہے اور قاری بھی۔ اصل میں انسانی جسم اور روح میں زندگی کی ساری داستانیں محفوظ ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وہبی سوچ کیا ہے؟ فہم کیا ہے؟ تو اس نظم کو پڑھتے ہوئے ذرا مزید سوچنا ہوگا۔ بعض مفکرین وہبی سوچ کے لیے my thic al thought کی ترکیب استعمال کرتے ہیں لیکن اگر فہم کو تخیلہ کی ارتقائی شکل تصور کر لیا جائے تو کیا اس نظریے سے انکار ممکن ہوگا؟ اصل میں تعقل اور تخیلہ حقیقت کو جاننے کے دو مختلف طریق ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ شاعری میں عموماً animism یعنی مظاہر پرستی کی جانب شعرا کا رجحان موجود رہتا ہے۔ اگر شاعر انسان، حیوان،

شے، غرض کائنات کے مظاہر پر بات کرسکتا ہے تو وہ کیوں بیج یا انسانی روح کے جنم پر بات نہیں کرسکتا۔ اس نظم میں تخلیق کار کی خواہش تو یہی ہے کہ وہ ایک "کُل" سے کٹ کر خود کو ایک نئے "کُل" میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھے لیکن اس کی موجودگی کتنے یگوں سے خاکدانِ غیر پر اس کے غیاب کو بھی محسوس کر رہی ہے۔ یعنی کمال کی بات یہ ہے کہ روح و جسم کے اتصال باہم اور توڑ پھوڑ کے منفی لیکن توانا عمل نے نظم کو ایک نئے راستے پر ڈال دیا ہے۔ نظم میں ذات اور تمنا کا جو خاموش زون ہے، وہ ذات کے اُس پہلو سے مکالمے کی کوشش کرتا ہے جہاں خواہش ایک ایسی تیز دھار تلوار پر گامزن دکھائی دیتی ہے جو بال سے بھی زیادہ باریک ہو۔ یہ سارا عمل داخلی کرب کے انتشار اور شور کا نتیجہ ہے، مگر اس کے باوجود یہ روح کی بے آواز صداؤں کی طرف متوجہ رہتا ہے۔

یہ نظم کسی نہ کسی سطح پر زمان و مکان ہی نہیں، پوری کائنات کی تخلیق پر سوال اُٹھاتی نظر آتی ہے۔ یہ استفسار کہ ہم کائنات کے ان عظیم اسرار کو محض ایک اتفاق، وقوعہ یا حادثہ قرار دے کر کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں، ایک ایسا بنیادی سوال ہے جو ہمیشہ سے فلسفیوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ ارتقائی عمل کے پیچھے کون سا پوشیدہ ہاتھ کارفرما ہے؟ غالب کے بقول:

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے کچھ ایسا کہ اٹھائے نہ بنے

یقیناً، یہ طے ہے کہ کائنات اپنی تمام تر متنوع، متغیر اور متحرک صورتوں میں، اپنی جمالیاتی معنویت اور باوقار ہمہ جہتی کے ساتھ، ایک کثیرالمقاصد تخلیقی توانائی کے تابع ہے۔ یہ ہمہ رنگی، یہ لطیف کاری، یہ پُرشکوہ زمانی و مکانی انرجی نہ صرف یہ کہ کائنات کے تحرک کی مظہر ہے بل کہ خود اس تحرک کا محرک بھی ہے۔ یہ مسلسل رفتار، دراصل تقلیب و تبدیلی کے ایک نہ ختم ہونے والے عمل سے گزر رہی ہے۔ وہی "میں" یا "ہُ" جس کی موجودگی ہر شے میں ایک غیر مرئی سہارے کی طرح پیوست ہے۔ جو وقت کا متروک آسن ہے---؟ سوال یہ ہے کیا نظم کا متکلم کائنات کی اس متغیر، متنوع اور متحرک جمالیاتی معنویت کا شاہد ہے یا وہ خود وقت ہے؟ وقت کا متروک آسن" بن جانا وہ حتمی کیفیت ہے جہاں شاعر مروجہ وقت سے کٹ کر ایک ایسے وقت میں داخل ہوتا ہے جو linear نہیں layered ہے جہاں ماضی، حال اور مستقبل ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نادیدہ و دیدہ زمان ملتے ہیں۔ آگے چل کر شاعر کچھ یوں مخاطب ہے:

میں جولاں گاہِ باطن سے اُبھرتا ہوں
تو لگتا ہے
کمانِ کائناتِ ہست میں
سب تیر میری سانس کے ہیں
یہ مکان و لامکاں

....

مشاطگی کرتے ہیں میرے حُسن کی
بادِ صبا جھولا جھلاتی ہے
مرے کینڈے میں آجاتے ہیں مفتوحہ علاقے

....

یقیناً اس نظم کا شاعر ایک "تخلیق کار" ہے اور یہ وہی تخلیق کار ہے جو اس کائنات کا تخلیق کنندہ ہے۔ وہ لہجہ (سخن میں نظم طراز ہے تو کیا اس نظم میں وہ خود جلوہ گر نظر نہیں آرہا۔۔۔ تو کیا اس نظم کو حمد سے تعبیر کیا جائے؟ میرا خیال ہے اس کلام کو سمجھنے کے لیے جدید اور مابعد جدید تکنیک کے فرق کو سمجھنا پڑے گا۔ جب کوئی متن سوال در سوال اٹھاتا چلا جاتا ہے اور difference یعنی تفریق سے اور differ یعنی تعطل کی جانب رخ موڑتا چلا جاتا ہے تو وہ متن ایک desire یا طلب سے جڑ جاتا ہے - جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا بنیادی فرق یہی ہے کہ جدیدیت میں symptom پر زیادہ زور ہے جبکہ مابعد جدیدیت mutant یعنی تغیّر پذیر ہے جیسے کہ اب حسن کی نظر میں مابعد جدیدیت کثیر الشکلی بھی ہے اور دو جنسی بھی یعنی اس متن کی غیر معنیاتی فضا ہی میں مابعد جدیدیت کا کیف مضمر ہے۔

اب ایک اور سوال جو مجھے بطور قاری در پیش ہے کہ کیا یہ متن تعلیق سے عبارت ہے؟ ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ یہ متن معنی، پس معنی، معنی در معنی کے تصور کو الٹ کر معنی رد معنی میں بدل رہا ہے تو اس کا مطلب ہے اس نظم میں معنی deconstruct ہوتے ہوئے کچھ آگے منزلیں طے کرتے ہیں اور کثیر المعنویت یعنی معنی کشائی اور معنی کاری کے مسلسل عمل سے عبارت ہیں۔ اب ذرا اس نظم کے اس حصے کو دیکھتے ہیں جو اوپر میرے کہے کو رد کر رہا ہے۔ "وہ لہجہ سخن میں نظم طراز ہے۔" میرے اس لکھے کو اس متن نے اپنی معنی کشائی کے عمل میں ہی رد کر دیا ہے دیکھیے:

میری جلد سے خود ہی
مری جھلّی اترتی ہے
مری تقویم میں
اکھوے نکلتے ہیں نئے امکان کے
وحشت کے گھیرے میں
نمو پاتی ہے تنہائی
تسلسل کے اندھیرے میں
ابد کی چھتریاں کھلتی ہیں۔۔۔"

....

یہ نظم ایک ایسے وجود کی آواز ہے جو زمان و مکاں کے رسمی پیمانوں سے ماورا ہو چکا ہے۔ اُس کی آواز، وقت کے دائرے سے نکل کر کائنات کے ابتدائی امکان کی سرگوشی بن جاتی ہے۔ شاعر محض ایک معاصر شعری ہستی نہیں بل کہ صدیاں، یُگ، عہد اور عناصر اس کے باطن میں جذب ہو چکے ہیں۔ خاکدانِ غیر پر خیمہ زن ہونا ایک وجودی جلاوطنی کا استعارہ بھی ہے، ایک ایسی بے گانگی جو ہر بڑے فنکار کی تخلیقی تقدیر بن جاتی ہے۔ یہاں شاعر شکست کو فنا کے ہم معنی نہیں

ماننا بل کہ وہ ہر زوال سے ایک نئی تخلیق، ایک نئی ہیئت، ایک نئی انرجی کشید کرتا ہے۔ وہ اپنے اندر سے ''اکھوے'' نکالتا ہے۔ نئے امکانات کے یہ اکھوے فطری نشو و نما ہی نہیں، تجلّی اور وجودی نمو کی علامت بھی ہیں۔ تجلّی کا مسکرانا دراصل اُس بصیرت کا ظہور ہے جو صرف مکاشفے سے حاصل ہوتی ہے، نہ کہ مشاہدے سے۔ مکاشفے کے اس سفر میں بقول ڈاکٹر وزیر آغا ''معنی اگر مسافر ہے تو آواز ناؤ ہے۔ معنی نے آواز کی ناؤ کہیں باہر سے حاصل نہیں کی بلکہ اپنی ہی پسلی سے برآمد کی ہے---'' یہ بات درست ہے کہ ہر حرف ایک آواز ہے مگر یاد رہے حرف جُڑ کر ایک لفظ یا morpheme بنتے ہیں اور نشان کی منزل کو پہنچتے ہیں۔ مجھے اس نظم کے مدلول signified سے مسئلہ ہے کہ معنی مسلسل اپنی سطح پر تبدیل ہو رہا ہے یعنی کسی ایک معنی پر ٹک نہیں رہا:

جھلی کا اترنا

وحشت کا گھیرا

نسوانی تنہائی

تسلسل کا اندھیرا

ابد کی چھتریاں

....

یہ سب قاری کو تجریدی مدلول کی جانب دھکیلنے کے عمل میں شامل تراکیب ہیں؟ ان کی آوازیں کسی ایک معنی کو متصور نہیں کر پا رہیں۔ یعنی یہ نظم abstract form کے ساتھ حتمی معنی سے انحراف کر رہی ہے۔ سوال در سوال پر مہمیز کرتی یہ نظم اصل میں معنی کی غیر معین صورت کے تئیں اکساتی ہے اور للچاتی ہے اور یہی اس نظم کا مُلادہ ہے۔ دیکھیں یہ تو طے ہے کہ ہر خالص شعری واردات علامتی ہوتی ہے۔ اصل میں یہاں اس نظم میں علامتیں لاشعوری اور شعوری رویے کے درمیان واسطے کا کام انجام دے رہی ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ شعور جب کوئی سوال پوچھتا ہے تو جواب میں لاشعور کوئی علامت یا علامتوں کا کوئی سلسلہ، جن کا اساطیر، مذہب، روح یا لوک ودیا میں اظہار ہوا ہو، فراہم کر دیتا ہے بعینہٖ اس نظم کی واردات میں ہوا ہے۔ یہ کس کا کلام ہے؟ ملاحظہ کیجیے:

''میرے جسم میں

دیدہ و نادیدہ زماں آپس میں ملتے ہیں

کشش پانی کی

صحراؤں کی جانب کھینچتی ہے

باغ اُگ آتے ہیں

کیچڑ میں ستارے

شبد کی ٹہنی پہ کھلتے ہیں--''

....

یہاں شاعر لاؤ تھسنگ کے ذریعے فن کے مکاشفانہ وجود کا جواز حاصل کرتا ہے۔ ہر سطر میں وہ کچھ ایسے مناظر دکھا رہا ہے جو ہوشربا ہیں۔ وہ تجلّی کو مسکراتے ہوئے دیکھتا ہے، گویا یہ زمانی تناظر روح کی کوئی مسلسل

واردات ہے یا پھر کائنات کی خلقی قوت کا وہ اظہار جو زمان و مکاں کی صورت میں متلفظ ہو رہا ہے۔ شاعر کیچڑ میں "شبد" کی ٹہنی پر ستاروں کو کھلتے دیکھ رہا ہے۔ وہ مصور کا روپ دھار چکا ہے۔ خیال سے لکیریں کھینچ رہا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ اس پر زمان و مکاں کے لاتعداد امکانات حاوی ہیں جن کا تصور بیک وقت تجرید، علامت اور اشارے کے وسیلے سے انسانی ہستی کی مخفی توانائی کو لفظوں کی صورت دے کر کائنات کی بے کرانی کو نئے زاویوں سے خلق کر رہا ہے۔

بلاشبہ کائنات کی لامتناہیت کے مکمل علم سے آشنا ہونا انسان کے بس میں نہیں مگر یہاں بھی علم ہی اس کے کام آتا ہے۔ سورہ الرحمٰن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: "اگر تم میں آسمانوں اور زمین کی حدود یا مداروں سے نکل جانے کی استطاعت ہے تو نکل جاؤ، تم نہیں نکل سکتے مگر علم کی قوت سے۔ گویا علم وہ بنیادی جوہر ہے جس کے ذریعے انسان مادی کائنات کو نہ صرف سمجھتا ہے بل کہ اس کی حدیں عبور کرنے کا اہل بنتا ہے۔ جہاں سائنس دانوں نے ستاروں پر کمند ڈال کر کائنات کی مادی ساخت کو تسخیر کرنے کی کوشش کی، وہاں شاعر نے تخیل کی مدد سے کائنات کو معنوی سطح پر گرفت میں لیا۔ یہ تخیل محض تصوراتی پرواز نہیں، ایک مکاشفہ ہے جو کائناتی حقیقت کے ملفوف پہلوؤں کو آشکار کرتا ہے۔ یہی تناظر ہمیں وائٹ ہیڈ کے اُس تصور کی جانب لے جاتا ہے جس میں مادے کا فطری بہاؤ دراصل ایک مسلسل تخلیقی بہاؤ کے مترادف ہے۔ اسی بہاؤ کا عکس ہمیں اس نظم کے متکلم میں بھی دکھائی دیتا ہے جو تجلیل کے زوال اور جزیت کے راز کو اپنی ذات میں آمیخت کر کے خود شناسی کی سطح پر پہنچتا ہے اور مادی و حسی کیفیات کو اس طرح برتتا ہے کہ کائناتی حرکت کے مناظر غیر معمولی رنگ و آہنگ کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ وہ خود کو جھولا جھلانے کے لیے بادِ صبا کے سپرد کر دیتا ہے۔ کہیں وہ خود کو ہزاروں سال کی آوارگی سے تشبیہ دیتا ہے اور کہیں وقت کا متروک آسن قرار دیتا ہے۔ وہ قاری کو سب کچھ دکھا رہا ہے۔ کچھ اشاروں میں، کچھ نظاروں میں۔۔۔ لیکن کیا قاری ان مجرد شبیہوں اور علامتوں کے ذریعے قدیمی آدمی سے مل پاتا ہے جو پسِ تاریخ کا آدمی ہے؟ یہی سوال اس نظم کے مطالعے کی روح ہے۔ یہ نظم کائنات کی طرح توسیع کے ہوشربا عمل میں مصروف نظر آتی ہے جیسے کوئی خاکدانِ غیر میں صدیوں سے خیمہ زن ہو اور اُس توسیع کو دیکھ رہا ہو۔ اس نظم کی فطرت میں ہی التوا و افتراق ہے۔ یہاں عدم تطبیق ہی نظم کے معنوی تنوع کو مکمل کرتی ہے، اور ہر غیر مکمل دلالت نئے معنوں کے امکان کو جنم دیتی ہے۔ یہی اس نظم کا مطلق حُسن ہے۔۔۔ ایک ایسا حُسن جو تعلیق میں ہی اپنا وجود پاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

برگیڈئر (ر) محمد یوسف کا مجموعہ کلام ’’آخرِ شب کے مسافر‘‘

ضلع چکوال کا دبستان شاعری نہایت زرخیز، پُر بہار اور دلآویز شعرا کے دم قدم سے ہمیشہ درخشاں رہا ہے۔ خطہ مردم خیز میں شاعری کا سفر ازل سے تادم تحریر جاری وساری ہے۔ عسکری شخصیات مصنفین و شعرا بھی ہیں۔ بابا شاہ مراد خانپوری (1626-1702) سے بریگیڈئر (ر) محمد یوسف تک سفر صدیوں پر محیط ہے۔ بلند مرتبہ شاعروں نے اپنی اپنی منفرد شاعری کے بے شمار پیراہن ہائے رنگا رنگ سے ادب عالیہ کو موثر اور معطر بنادیا۔ جنرل محمد اکبر المعروف رنگروٹ جنرل تجمل حسین ملک، جنرل عبدالمجید ملک، جنرل عبدالقیوم، بریگیڈئر گلزار احمد، بریگیڈیئر ایس کے ملک، بریگیڈیئر محمد یوسف، بریگیڈیئر محمد فاروق، کرنل محمد، اور کرنل ظہور جنجوعہ مصنفین ہیں۔ شاعری کے طلسم خانے میں بریگیڈئر محمد یوسف صاحب ہی فرد واحد ہیں۔ موصوف کے اس سے قبل آہٹ (1991) اور سرشہرِ غمگساراں (2019) شاعری کے مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ مزاح نگاری کی ایک کتاب سالٹ رینج کے سائے (2010) میں منظر عام پر آئی۔ ’’آخرِ شب کے مسافر‘‘ تیسرا مجموعہ کلام ہے۔

کالم نگار، مصنف، عسکری تجزیہ نگار وشاعر کا زیرِ نظر خوبصورت شعری مجموعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ بقول شعیب بن عزیز، ’’اب ایک عرصے سے دُنیا انھیں ایک معتبر مستند شاعر کی حیثیت سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ ’’آخری شب کے مسافر، ان کی شاعری کا تیسرا مجموعہ ہے...... جناب احمد ندیم قاسمی نے تقریباً نصف صدی پیشتر محمد یوسف صاحب کی شاعری کو سراہا تھا اور انھیں تلقین

آفتاب احمد خیرپوری

کی تھی وہ شاعری کے ساتھ اپنا رشتہ منقطع نہ کریں۔ آج یہ شعری مجموعہ قاسمی صاحب کی پیشنگوئی کی صداقت اور شاعر کے اخلاص فن دونوں کی زندہ گواہی کے طور پر آپ کے ہاتھوں میں ہے..... بریگیڈیئر یوسف کی شاعری کا جہاں شاعر کی ذات سے وابستہ احساسات اور افکار کی دُنیا تک محدود نہیں بل کہ ان میں خارج دُنیا میں موجودہ سماجی ناہمواریوں اور معاشرتی بے انصافیوں پر کسک کا اظہار بھی ملتا ہے۔

ہم مسافر ہیں ، آخر شب کے
چل پڑیں ، کب ، کہیں، پتا تو نہیں
کوئی ویران کر گیا ہے شہر
لوگ کہتے ہیں کچھ ہوا تو نہیں

....

زیر نظر مجموعہ کلام میں 73 غزلیات، 11 نظمیں، ایک ترانہ، پنجابی و نمکین غزل 31 قطعات اور 9 اشعار متفرقات میں شامل ہیں۔ شہر مستقل استعارہ ہے، جو 29 بار قند مکرر غزلیات میں استعمال ہوا ہے۔ امیر شہر، حاکم شہر، کربلا، فرات، غم جاناں غم دوراں، ویراں آنکھیں، یادوں کے دیپ، چراغ شام، راجدھانی، فصیل شہر جنوں عشق، سوچتے پھول، دل کا شیشہ، مسافر، پیار کی کشتی، 15 اشعار پر مشتمل معنی خیز غزل کے اشعار کئی موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ (صفحہ نمبر 125-124)

محبت کے سمندر میں، نہ طوفاں کو صدائیں دو
یہ کشتی ڈوب جانے میں بھی کتنی دیر لگتی ہے
غم دوراں کے فتنوں میں، اتنا زوراب یوسف
کسی کو بھول جانے میں بھی کتنی دیر لگتی ہے

ایک قطعہ دیکھیے :

جدھر دیکھو فقط آہ و فغاں ہے
خوشی کہتے تھے جس کو اب کہاں ہے
خدا کی جیسے رحمت چھن گئی ہو
عذابوں میں گھرا اب یہ جہاں ہے

....

بقول سرفراز سیّد کہ ”جہاں تک بریگیڈیئر یوسف کی شاعری کا تعلق ہے۔ وہاں ہجر کے دکھ بھی ہیں کسی کی بے رُخی اور وعدہ شکنی کا ذکر بھی ہے۔ غربت کے ماروں کا بیاں بھی ہے۔ اور مجموعی طور پر معاشرے میں پھیلے ہوئے ظلم اور بے انصافی کی عکاسی بھی ہے۔“ (صفحہ نمبر 31)

باقی احمد پوری کی رائے ہے۔ ”محمد یوسف کی شاعری میں تخلیقی سچائی نظر آتی ہے۔ وہ

آشوب شہر کو دیکھ کر آنکھیں بند کر کے نہیں گزر جاتے بلکہ اپنے مشاہدے کو لوگوں کے ساتھ شیئر بھی کرتے ہیں۔ جناب محمد یوسف صاحب کی شاعری میں بھی عصری شعور سے لبریز اشعار جابجا ان کی غزلوں میں نظر آتے ہیں۔" (صفحہ نمبر 19)

عرض حال کے عنوان سے فاضل مُصنف و شاعر رقمطراز ہیں کہ "مجھے ہر زبان کی اچھی شاعری پڑھنے اور سُننے کا بے حد شوق ہے۔ لیکن اپنی شاعری سنانے سے پرہیز کرتا ہوں۔ کہ یہ میرا شغلہ ہے اور شغل صرف اپنے لیے یا پڑھنے والوں کے لیے ہونا چاہیے۔ اس کے لیے میں وقت ضرور نکالتا ہوں۔ البتہ اب زیادہ وقت اپنے رب کی یاد میں گزارنا اچھا لگتا ہے۔" (صفحہ نمبر 21)

انتساب زندگی کے رائیگاں لمحوں کے نام:

میری ساری زندگی کو بے ثمر اُس نے کیا
عمر میری تھی مگر اُس کو بسر اُس نے کیا
(منیر نیازی)

کتاب کے فرنٹ ٹائٹل پر چلنے والے دو بوڑھوں بابوں کی تصویریں "آخر شب کے مسافر" بیک ورق پر فوجی وردی میں شاعری کی رنگین تصاویر و مختصر سوانحی خاکہ درج ہے۔

142 صفحات پر مشتمل اس خوب صورت مجموعہ کلام کو معروف اشاعتی ادارے، قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل لاہور نے دیدہ زیب ورق پر شائع کیا ہے۔ بریگیڈئر محمد یوسف صاحب اشاعت پر دلی مُبارکباد کے مستحق ہیں۔ چند منتخب اشعار:

دل بُجھے اور سُلگتی ہوئی ویراں آنکھیں
شہر والوں کے عجب شام و سحر دیکھے ہیں

میرے درد کے فسانے، سارے جہاں کو بھائے
میری اُداسیوں کو میرا مہرباں نہ سمجھا

تمام عمر گزاری جسے بھلاتے ہوئے
اس دل کے شہر میں یوسف وہی تو بستی ہے

کوئی لائے یہاں فرات سے نہر
خلقت شہر کب کی پیاسی ہے

غریبوں کے گھروں کا ہے مقدر
جواں بیٹیوں کا کب ماتم نہیں تھا

گھر بار اُجڑ جائیں تو بن جاتے ہیں پھر سے
آباد سدا میرا وطن دل کی دعا ہے

☆☆☆☆☆

......درود پڑھتے ہوئے......

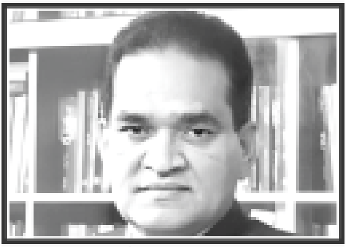

انسان اللہ پاک کی بہترین تخلیق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے سب سے بڑے انعام قرآن سے نوازا۔ قرآن لازوال ہے، بے مثال ہے اور صاحبِ قرآن کی شان قرآن نازل کرنے والا ہی جانتا ہے۔ اللہ پاک کی ذات کی توصیف کرنے کا فن اللہ تعالیٰ کے نبیؐ جانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نبیؐ کی توصیف کا حق اللہ تعالیٰ ہی ادا کر سکتے ہیں۔ انسان تو اتنا ہی کہہ سکتا ہے

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

ایک مغربی مفکر کے بقول:۔

"جس کسی کو مسلمانوں کی حُبِ رسولؐ کی خبر نہ ہو، وہ اسلام کی قوت کا احساس کر ہی نہیں سکتا۔ حُبِ رسولؐ کا جذبہ ایسا شدید ہے کہ اسے تصوف کی گرمی نفس کے مماثل کہہ سکتے ہیں۔ ذاتِ رسولؐ سے محبت مسلمانوں کی وحدت اتحاد کا ایک بڑا موجب ہے"۔

پیغمبر خداؐ کے ثنا خوان کا رتبہ بیان کرنے سے الفاظ قاصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں۔ بنی نوع انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی فلاح کے لیے پاک پیغمبرؐ پر درود بھیجیں۔ نبیؐ پاک کی ثنا خوانی مسلمان کا بنیادی فریضہ ہے۔ وہ لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں جنھیں نعت کہنے کی توفیق ملتی ہے۔ قرآن کی آیت کا مفہوم ہے "اے نبی! ہم نے تمھاری خاطر تمھارا ذکر بلند کر دیا"۔ ایک اور ارشاد کا مفہوم ہے "اللہ کا رنگ اختیار کرو اور کس کا رنگ اچھا ہے، اللہ کے رنگ سے اور ہم اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں"۔ اللہ کا رنگ سمجھنے کے لیے حیاتِ طیبہ کا مطالعہ ضروری ہے کیونکہ یہ رنگ اسی ذات میں نظر آتا ہے، جسے ہمارے لیے نمونہ برائے تقلید قرار دیا گیا ہے۔ مسلمان جب تک حضرت محمدؐ کی ذات سے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبت نہ کرے، اس کا ایمان ادھورا رہتا ہے۔ نبیؐ پاک سے محبت کے اظہار کا ایک ذریعہ نعت خوانی ہے۔ ایک صوفی بزرگ کے بقول "اللہ تعالیٰ حقیقی نعت خواں ہے۔ تمام آسمانی کتابوں

سیف اللہ بھٹی

میں پیغمبرِ آخر الزماں کی توصیف کی گئی ہے"۔ نعت خوانی کا آغاز حضورؐ کے دور سے ہو گیا تھا۔ حضرت حسان بن ثابت، حضرت کعب بن زہیر اور حضرت عبداللہ بن رواحہ سمیت دیگر صحابہ کرام نے نعت کہی ہے۔

نعت کی روایت عربی اور فارسی سے ہوتی ہوئی اردو میں ظہور پذیر ہوئی۔ اردو کے ہر بڑے شاعر نے نعتیہ کلام کہا ہے۔ مسلم اور غیر مسلم شعرا نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ثنا خوانی کرتے رہے ہیں۔ مقامی زبانوں میں بھی نعت خوانی کی گئی ہے۔ حضرت مہر علی شاہ کے اشعار ضرب المثل کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔

کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا
گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں

....

علی رضا کے ایک خوب صورت نعتیہ مجموعے "درود پڑھتے ہو" کا مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ آپ اعلیٰ پائے کے نعت گو شاعر ہیں اور اپنی زندگی نعت کے لیے وقف کر چکے ہیں۔ کتاب کا پہلا صفحہ پلٹا تو شعر پڑھ کر بے اختیار منہ سے سبحان اللہ ادا ہوا۔ شعر پیشِ خدمت ہے:۔

درود پڑھتے ہوئے، نعت گنگناتے ہوئے
میں پل صراط سے گزروں گا مسکراتے ہوئے

....

ہر مسلمان کو پیغمبرِ خدا کی شفاعت پر اتنا ہی یقین ہونا چاہیے۔ انتساب پڑھ کر اندازہ ہوا کہ شاعر کو عشقِ رسولؐ کی دولت اپنے مرحوم والدین سے ورثے میں ملی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے والدین کے درجات بلند فرمائے۔ نیک اولاد سے بڑا صدقہ جاریہ کوئی نہیں۔ اگلے صفحے پر لکھا ہوا شعر بھی سراہے جانے کے قابل ہے:

یوں قلبِ حزیں آپؐ کی رحمت سے ہے شاداب
جیسے ہو ثمر بار شجر فصلِ خزاں میں

....

علی رضا کی زندگی کا مقصد پیشِ خدمت ہے:

یہ زندگی طیبہ کی گدائی کے لیے ہے
آقا کی فقط مداح سرائی کے لیے ہے

....

اپنی تعلیم و تربیت کے بارے میں دریا کوزے میں بند کر دیا ہے:

سکھائے آپ نے آداب زندگی مجھ کو
شعور زندگی کرنے کا آپ ہی سے ملا

....

علی رضا کو اپنی اور انسانی بساط کا بھی خوب اندازہ ہے:

ہو گئی شام زندگی کی رضا
حق مدحت ادا ہوا ہی نہیں

....

قبل ازیں ان کے تین نعتیہ مجموعے "ثنائے سرور"، "توصیف پیمبر" اور "پھلاں دی مہکار مدینے" (پنجابی) شائع ہو چکے ہیں۔ علی رضا بہت خوش نصیب شاعر ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے نعت گوئی کے ساتھ خوش الحانی بھی عطا کی ہے۔ علی رضا بہت اچھے مرتب اور مدون بھی ہیں۔ انھوں نے دو مجموعے ایسے شائع کیے جن سے ان کا نعتیہ انتخاب ان کے اچھے ذوق کی ترجمانی کرتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی علی رضا کے حوالے سے فرماتے ہیں۔ "علی رضا نے نعت نگاری کے فن

کی یادگار خدمت سرانجام دی ہے--- یہ انتخاب پڑھ کر خوش ذوق کاری کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ دورِ رواں میں شعرا نے نعت کو کیسے کیسے خوش نما رنگوں سے آراستہ کیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی اور تعلیماتِ گراں مایہ کو کتنے سلیقے سے نعت کا موضوع بنایا ہے"۔ ڈاکٹر خورشید رضوی علی رضا کی نعت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"علی رضا کے ہاں اساسِ نعت جذبۂ والہانہ پر اُستوار ہے۔ وہ ذات کے شعور اور دل کے گداز دونوں کا سرچشمہ اُس ذاتِ والا صفات کو تصور کرتا ہے جس کا اسمِ مطہر ہر قدم پر اُس کا رہنما ہے اور جس کے لائے ہوئے دستور سے زمانہ منقلب ہو گیا۔ علی رضا کے نزدیک سوچوں کو باوضو رکھنا آدابِ نعت گوئی میں شامل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ رحمۃ اللعالمینی اُس کے خیال میں فراخ دلی اور رواداری کی بنیاد فراہم کرتی ہے"۔

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"نعت میں وہی ذکر ہونا چاہیے جو اللہ تعالٰی کے پیارے پیغمبر حضرت محمدؐ کے شایانِ شان ہے۔ جس کے پڑھنے اور سنانے سے لوگوں پر روحانی اور اخلاقی اثر پڑے اور یہ بھی معلوم ہو کہ کمالِ بشریت اسے کہتے ہیں"۔

کتاب میں شامل تمام نعتیہ کلام اس معیار پر پورا اترتا ہے۔ مجید امجد کہتے ہیں:

"نعت لکھنے والوں کا مرتبہ انسانی اکتسابات کی معراج ہے۔ اس کا ہر سانس دیدارِ حبیب کی منزل ہے۔ وہ فرشتوں کا ہم زبان ہے اور تمام ارواحِ مبارکہ کو ہمنوا ہے۔ اس کی زبان پر پیغمبرؐ کی مداح ہے جس کی مداح خود اللہ رب العزت نے کی ہے"۔

علی رضا کو یہ بلند رتبہ اللہ تعالٰی کے کرم سے ملا ہے۔ ہم ان کے لیے دعا گو ہیں۔ ایک مصنف کے بقول "علی رضا کے نعتیہ کلام سے معلوم ہوتا ہے ان کی سیرتِ مطہرہ پر گہری نظر ہے۔ ان کا نعتیہ کلام عشقِ مصطفٰی سے لبریز ہے"۔

تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سیرت کا مطالعہ کریں۔ علی رضا کی خالقِ کائنات سے مانگی گئی دعا ہم سب کے دل کی آواز ہے:-

وہ بصیرت وہ رہنمائی دے
ہر حقیقت مجھے دکھائی دے

میرے لفظوں سے خوشبوئیں پھوٹیں
میری سوچوں کو پارسائی دے

تیری حمد و ثنا میں عمر کٹے
بس یہی طرزِ خوشنوائی دے

روح کو رکھ حصار میں اپنے
دل کو آفات سے رہائی دے

عجز میرا کمال تک پہنچے
اپنے محبوب کی گدائی دے

مجھ کو رکھ کنجِ بے نشاں میں مدام
کب کہا ذوقِ خود نمائی دے

سلطنت درد کی عطا کر کے
منزلِ شوق تک رسائی دے

☆☆☆☆☆

محمد ندیم صادق با تقلید ناصر کاظمی

ہمارے بزرگوں کے کسی شاعر کو خراج تحسین پیش کرنے کے طریقوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس شاعر کو خراج تحسین پیش کرنا ہو، اسی کے رنگ میں شعر کہے جائیں۔ خراج تحسین کا یہ طریقہ نہایت عمدہ اور موزوں ہے۔ اگرچہ اس میں تکلف کو بڑا دخل ہوتا ہے لیکن اگر اپنا مزاج بھی اس شاعر سے ملتا ہو تو بات آسان ہو جاتی ہے۔ محمد ندیم صادق نے ناصر کاظمی کی "پہلی بارش" کے رنگ میں پوری کتاب "جگر خوں کروں ہوں میں" پیش کر کے ناصر کاظمی کو بہت عمدہ طریقے سے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ندیم کی کتاب میں 22 غزلیں بشمول حمد اور 21 نظمیں ہو بہو ناصر کاظمی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ تمام نظمیں معریٰ ہیں، سو ردیف اور قافیہ تو فارغ ہوئے، بحر البتہ ناصر کاظمی کی ہے۔ غزلوں میں بھی ناصر ہی کی بحر اختیار کی گئی ہے اور قافیہ بھی وہی ہے البتہ ردیف بدل گئی ہے۔ ناصر کاظمی کی ردیف "تھا" ہے جبکہ ندیم کی ردیف "ہے" ہے۔ گویا ندیم نے ناصر کے ماضی کو حال بنانے کی کوشش کی ہے۔ ندیم نے ناصر کاظمی سے عقیدت اور اس کا رنگ اختیار کرنے کا اظہار یوں کیا ہے:

ناصر کی پہلی بارش میں
صادق پورا بھیگ چکا ہے

میر و ناصر میرے مرشد
مجھ پہ ان کا رنگ چڑھا ہے

پہلی بارش جب سے دیکھی
مجھ پہ اس کا اثر ہوا ہے

لوگ پوچھتے ہیں کیا غم ہے
رنگ ترا بھی ناصر سا ہے

....

کسی بڑے شاعر کا تتبع کرنا اور اس کے رنگ میں لکھنا بجائے خود بہت بڑا امتحان ہوتا ہے۔ یہ ایک مشکل راستے کا انتخاب ہوتا ہے کیونکہ بڑے شعرا کے مخصوص رنگ اور اس کی طرز کا حق ادا کرنا سہل مرحلہ بالکل نہیں خواہ وہ رنگ غالب کی مشکل پسندی کا ہو یا ناصر کاظمی کی سادہ گوئی کا، اقبال کا فلسفہ ہو یا درد کا تصوف، کوئی مرحلہ بھی آسان نہیں ہے۔ ندیم نے ناصر کاظمی کا رنگ اختیار کر کے اپنی شاعری کے لیے مشکل رستے کا انتخاب کر لیا ہے۔ اس رنگ

عمر فاروق وڑائچ

میں شعر کہنا بھی آسان نہیں لیکن پھر بھی ندیم کے ہاں کئی اچھے اشعار ملتے ہیں، جنھیں کامیاب تتبع کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ بطور مثال یہ اشعار دیکھیں:

تیرے شہر میں آ کر مجھ کو
اپنا آپ ہی بھول گیا ہے

ایک وہ دن تو ساتھ تھا میرے
ایک یہ دن تو چھوڑ گیا ہے

ساری گلیاں گھوم چکا ہوں
تیری گلی سے ڈر لگتا ہے

....

بقول ڈاکٹر محمد افتخار شفیع، ندیم صادق کی شاعری پہلی قرأت من وتو کی شاعری محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات بہت درست ہے۔ اس مجموعہ کلام میں من وتو کے سوا باقی چیزوں کی اہمیت ثانوی ہے اور یہ اضافی ہیں۔ بل کہ میں تو یوں کہوں گا کہ اس میں صرف ''من'' ہی مقصود ہے، ''تو'' بھی اضافی ہے۔

ساری دنیا پاس ہے صادق
پھر بھی تو کتنا تنہا ہے

شہر کی سڑکیں تو ٹھنڈی ہیں
لیکن میرا دل جلتا ہے

....

''جگر خوں کروں ہوں میں'' پڑھتے ہوئے کئی بار پتھروں، خشک پتوں اور زرد پڑتے درختوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ گاہے گاہے

چاند بھی دکھائی دیتا ہے۔ ہر جگہ اداسی پھیلی ہوئی ہے اور یاس کا عنصر نمایاں ہے۔ یہ اشارے شاعر کے انتہائی حساس بلکہ جس انداز میں واقع ہوئے ہیں، ضرورت سے زیادہ حساس ہونے کو ظاہر کرتے ہیں۔

ٹہنی ٹہنی سوکھ چلی ہے
پتا پتا خشک ہوا ہے

سارے پتے زرد ہوئے ہیں
پیڑ کو کیا غم ہو سکتا ہے؟

موم کی مورت چاند سی صورت
جانے دل کیوں پتھر کا ہے

اس دل کی نگری کا راجا
پتھر ہے یا پتھر کا ہے

چاند کو دیکھ کے مجھ کو ہمیشہ
یاد ترا چہرہ آتا ہے

چاند بادلوں میں چھپ چھپ کر
مجھ کو تنگ بہت کرتا ہے

....

اس مجموعے کی کم و بیش تمام غزلیں ہی غزل مسلسل کا نمونہ ہیں۔ اس سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ شاعر کا اصل رجحان نظم کی جانب ہے اور وہ تکلفاً غزل کہنے میں مشغول ہے۔

☆☆☆☆☆

کہانی چل رہی ہے (مائیکروف)

باتیں کرنے کا کیا فائدہ۔ آتے ہیں کچھ باتوں کے شوقین۔ پوچھتے ہیں کیا کہانی ہے تمھاری، کہاں سے آئی ہو؟

پر وہ کم ہی ہوتے ہیں۔ زیادہ تر تو--- ہاہاہا--- اب میں تمھیں کیا بتاؤں۔ ایک دن کی بات سنو۔ بس اتنا کہا ''کنڈی لگا دو'' میں دروازہ لاک کر کے پلٹی تو توبہ---- وہ الف ننگا کھڑا تھا۔ لو جی بس یہی تین لفظ بولے اس نے پوری ملاقات میں۔

کئی باتونی بھی آ جاتے ہیں۔ تمھاری طرح۔ باتیں زیادہ، کام کم، پر کام چھوڑتا کوئی نہیں۔ آج تک مجھے تو کوئی ایسا نہ ملا جو بس باتیں کرنے کے پیسے دے جائے---

پھر کہانی؟ ارے کہانی کیا ہوتی ہے۔

20 سال کی ہوں۔ چار سال سے آنٹی کے پاس ہوں۔ آنٹی مجھے کہتی ہے ''میری چڑیا'' میں کہتی ہوں ''ہاں سونے کی چڑیا۔''

تھکتی نہیں ہوں میں۔ پتلی سی تو ہوں۔ میں نے کیا تھکنا ہے۔ تھکتے تو موٹے بندے ہیں۔ ہاں پہلے کبھی کبھار گردن کے پٹھوں میں درد ہو جاتا تھا یا ٹانگوں میں۔ اب وہ بھی نہیں ہوتا۔ عادت ہو گئی ہے نا اس لیے۔

کہانی؟ پھر وہی کہانی۔ کہانی کیا ہوتی ہے؟

ہم چار بہنیں اور باپ کو ایمانداری کا بخار۔ پانچواں بھائی تھا وہ بڑے بخار سے مر گیا۔ پولیس مین کی تنخواہ ہی کتنی ہوتی ہے اس سے زیادہ تو گول گپے والا کما لیتا ہے۔

ایمان داری کے مرض والا یہاں کتنی اذیت سہتا ہے۔ ابا کے ساتھ کے کانسٹیبل دو دو گاڑیوں کے مالک ہو گئے اور ابا کے پاس وہی پرانی سائیکل۔

آج میں سوچتی ہوں تو ابا کی اذیت سمجھ میں آتی ہے۔ ہم سب ابا سے ناراض رہتے تھے۔ بس اماں ابا کا ساتھ دیتیں۔ ہم نے ابا کو پڑوسیوں کی خوشحالی کے طعنے دیے۔ اس کے ساتھی کانسٹیبلوں کی دولت کے طعنے دیے۔

کوئی تھوڑی اذیت تھی۔ عید، بقر عید، شادی، بیاہ، بیماری تعلیم --- اذیت ہی اذیت۔

ہم چاروں بہنیں دھریکوں کی طرح بڑھ رہی تھیں۔

شاید اسی سوچ میں ابا ایک رات سویا اور سوتا ہی رہ گیا۔

کہانی تو یہاں ختم ہو جاتی ہے لیکن میری کہانی چل رہی ہے۔

کبھی کبھی گھر بھی جاتی ہوں ---- لیکن دل نہیں لگتا وہاں۔ اماں کو کپڑے سیتے سیتے دمہ ہو گیا۔ اب بڑی بہن سیتی ہے۔ اسے بھی ہو جائے گا۔ بہنیں میرے نئے نئے کپڑوں اور زیورات کو بٹ بٹ تکتی ہیں تو میں گھبرا اٹھتی ہوں۔

کافی سارے پیسے اماں کے تکیے کے نیچے رکھ آتی ہوں۔ اماں نہ پیسے مانگتی ہے نہ دینے سے روکتی ہے۔

کہانی تو چل رہی ہے۔

اب تم بتاؤ باتیں ہی چلانی ہیں یا مگدر بھی چلانا ہے؟

☆☆☆☆☆

شہزاد نیّر

کثیر المعنویت (مائکروف)

کلی کے چہرے پر نشانات میں پیوست اساطیری کہانی کا عکس "استقرائی عمل کا استخراجی انداز" فطرت کی پراسراریت اور حالتِ سکون کی تکذیب کے بجائے محسوسات کی توانائیوں کا مؤید بنا نقاب کشائی کے صوفیانہ عمل کے عکس میں مقید ہو کر صدائے بازگشت کی معروضی دنیا میں غرق ہوتا گہرے شعور کی مانند ابھرتا تو خیالات و محسوسات کی دنیا نمودار ہوتی، جہاں زندگی کے رنگوں میں تصورات کا قدرتی بہاؤ خارج اور داخل کے انضمام کی نشاندہی کرتے ہوئے، حد کی جذباتی سطح پر بے قراری اور تشنج کے مرحلے سے گزر کر تنویر کے باطن میں ڈھلتے نوک پلک سنوارتے ریاضت و محنت کے مدارج طے کرتے "نروان حاصل کرنے کی سعی لاحاصل کو ریزہ ریزہ کر کے اس عمل کو The Night Journery سفرِ شب کا نام دیتے ہوئے سونے اور بیدار ہونے کی صورت میں ظاہر ہوتے، غیر شعوری تاثرات کی پرورش کو خیال کی پشت پر سوار کر کے تخلیقی عمل سے دست کش ہونے کے روپ میں ڈھل کر ابھرتے سورج کی آنکھ میں سوئی چبھوتا لمحہ روتے ہوئے طلوع ہوتی رات کی بانہوں میں سدھارتھ سے مکالمے کے بعد انتہائی مسرت و تسکین اور اوپر اٹھنے کی کیفیت سے مملو ہوتا ہے تو پھر اسے امرت منتھن کے دودھ کا ٹھہرا ہوا سمندر یاد آتا ہے یوں وہ بھی زور سے دودھ کے سمندر کو نوح کی مدد کے لیے پکارتا ہے پر ہر شے بے کنارو بے ہیئت زراج میں ڈھل جاتی ہے اور کوزہ گری کے دھندلکوں میں رقص کرتے پستان اس کے ہاتھوں میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ وہ مرمری جسم کی تنظیم میں خیالی شہوت کے رتھ پر سوار ہو کر جسم کی منزلیں طے کرتا ہوا بیضے اور جرثومے کی صدائیں سنتاؤں کی آواز کو بھی سنتا جاتا ہے، مگن مست الست کہ یکہ یک بندروں کا ایک غول اسے دبوچتا ہے اور وہ عکس، مراحلِ تخلیق کے نصف مدارج میں ہی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے یوں سفید ہاتھوں سے چٹکتے سرخ خلیوں میں وہ سانس لیتا ہے --- کہیں جنم لے کر مقدس بن کر رقص کرتا ہے اور کبھی کبھی آنکھوں کے بیچ اتر کر اپنی بدھی مکروہ شکل کو گھورتا ہے اور اسی لمحے کلی ہوا کی زد میں آ کر جھومتی ہے تو تالاب میں عکس مزید گہرا ہو جاتا ہے-------
جیسے کوئی تالاب میں ہنس رہا ہو----

☆☆☆☆☆

سید تحسین گیلانی

سولر پینل [افسانچہ]

عاصم بخاری

"ان گرمیوں میں "اے سی" لگا کے مزے سے سوئیں گے......"

خاور نے بڑے پرجوش انداز میں کہا

"کیوں خیر تو ہے، کیا بجلی سستی ہوگئی ہے......؟

"نہیں یار......بجلی کدھر سستی ہوتی ہے۔

"تو پھر......لوگ تو کولر کا بل بھی ادا کرنے عاجز ہیں اور تم......"

"سولر سسٹم لگوالیا ہے گھر کی چھت پر۔ اب دن رات اے سی چلے گا......"

"مزے کرو یار۔ ہمارے پاس تو اتنے پیسے نہیں کہ لاکھوں کا سولر سسٹم لگوا سکیں۔"

"ہمت کرو، ہمت......"

کوئی ایک ہفتے بعد موسم خراب ہوا، تیز آندھی چلی۔ طوفان بادوباراں نے خاور کے سولر پینلز کو چھت سے اٹھا کے گلی میں دے مارا۔

ساری سولر پلیٹیں ٹوٹ کر چکنا چور ہوگئیں۔

"بڑا افسوس ہے خاور، ...... یار تمہارا بہت نقصان ہوگیا"

میں افسوس کرنے جا پہنچا۔

"بس یار کیا کریں قسمت میں شاید یہی لکھا تھا"

آپ نے تو ساری اوپر کی کمائی بھی اس کام پر لگادی تھی مگر۔ خیر شکر کرو کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔

☆☆☆☆☆

بنجر، بانجھ [ماہ نگر وکاش]

''اللہ نے تمھیں اپنی نعمت سے نوازا بھی ہے یا ابھی بھی ویسے ہی معاملہ ہے، جیسے تھا۔'' ثمینہ کی ساس سے اس کی سہیلی نے پوچھا۔ پاس ہی کچن میں ثمینہ سبزی بنانے میں مصروف تھی۔

''کہاں؟ بہن! ہماری تو قسمت ہی پھوٹ چکی ہے۔ بارہ سال ہو گئے ہیں۔ کوئی آس، امید ہی نہیں ہے۔ کسی بنجر، بانجھ زمین کی طرح ویسی کی ویسی ہے۔ اور میرا بیٹا بھی اس جادوگرنی کے جادو میں ایسا مبتلا ہوا ہے کہ اسے چھوڑنے کا نام نہیں لے رہا۔ بہت بار سمجھایا ہے، کئی بار کہا ہے کہ اسے چھوڑ دو۔ طلاق دے دو! دوسری شادی کر لو! لیکن وہ میری بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا ہے۔ پھر یہ بھی کہا ہے کہ اسے نہیں چھوڑنا چاہتے ہو تو مت چھوڑو۔ دوسری شادی کر لو! لیکن وہ مانتا ہی نہیں ہے۔ بعض اوقات مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں یہ خواہش کہ پوتے، پوتیوں کے منھ دھو سکوں، لیے قبر میں ہی اتر جاؤں گی۔'' ثمینہ کی ساس اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی ہوئی بولی۔ اس کی آواز تھوڑی بلند تھی۔ وہ ثمینہ کو سنانا چاہ رہی تھی۔ اس طعن طرازیوں نے ثمینہ کو آنکھوں کو بھگو ڈالا۔ ادھر اس کا بیٹا جمال کب کا آیا، یہ تمام باتیں سن چکا تھا۔ وہ ایک بم کی طرح پھٹ پڑا۔

''امی! آپ کو کئی بار سمجھایا ہے کہ آپ ہر کسی سے یہ باتیں مت کیا کریں۔ لیکن نجانے آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں؟ اور بنجر، بانجھ آپ کی بہو نہیں بلکہ آپ کا بیٹا ہے، جسے اللہ نے اولاد پیدا کرنے کے لیے زرخیزی کی صلاحیت ہی نہیں بخشی ہے۔ میں ہر طرح سے صحت مند ہوں لیکن اولاد نہیں پیدا کر سکتا۔ میں یہ بات کبھی بھی لبوں پر نہیں لاتا۔ لیکن آپ کی ہٹ دھرمی نے آج مجھے اپنا یہ راز افشا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ آپ کو تو الٹا ثمینہ کا احسان مند ہونا چاہیے کہ وہ پچھلے بارہ سال سے مجھ سے نباہ کر رہی ہے۔ اور بے قصور ہونے کے باوجود بھی وہ آپ زہر فشانی سنتی آ رہی ہے، برداشت کر رہی ہے۔'' جمال جو پھوٹا تو اس نے ہیروشیما اور ناگاساکی جتنا اثر اپنی ماں پر ڈال دیا۔

اب جمال اپنے کمرے میں گھسا، آنسو بہا رہا تھا۔ کچن میں موجود ثمینہ کی آنکھوں سے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بے قابو سیل، رواں تھا۔ جس پر بند باندھنے کے لیے وہ انتہائی بے رحمی سے اپنی آنکھیں رگڑ رہی تھی۔

جمال کی ماں تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کے مصداق ہو چکی تھی۔ اس کی سہیلی کا منھ کھلا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆☆☆

بابر امین ابر

چاولوں کی خوشبو (افسانچہ)

راشد کے گھر ہمیشہ چاول پکتے ہیں۔ نرم، سفید، بھاپ اڑاتے، جیسے ہر دانہ اپنے اندر کوئی محبت کا انداز سموئے ہو۔ میں جب بھی اس سے ملنے جاتا ہوں، دسترخوان پر چاول ضرور ہوتے ہیں — کبھی مٹر پلاؤ، کبھی تیز مصالحے والا یخنی پلاؤ، اور کبھی سادہ اُبلے ہوئے چاول۔ لیکن چاول ہمیشہ۔

اس بار جب میں لاہور گیا تو حسب وعدہ مجھے راشد نے کہا: ”خالد بھائی! آپ کسی اور جگہ نہیں ٹھہریں گے بل کہ میرے پاس آئیں گے میں نے کہا یار ہر بار آتا ہوں مگر اس بار کسی رشتے دار کو وعدہ کیا ہوا ہے اب اسی کے پاس قیام کروں گا۔“

کہنے لگا: ”نہیں دوست! میں نے اپنا نیا گھر تمھیں دکھانا ہے۔ اور میں ہر مہینہ کی پچیس تاریخ کو خیرات کرتا ہوں اور خوش قسمتی سے، آپ پچیس تاریخ کو لاہور آرہے ہیں تو میں چاہتا ہوں آپ میرے گھر لازمی تشریف لے آئیں۔“

اس کے نئے گھر کے بارے سن کر میں نے اس کے ساتھ وعدہ کر لیا اور وعدے کے مطابق اس کے گھر پہنچ گیا۔

راشد کا مکان تین منزلہ ہے، تنگ گلی میں آباد وہ چھوٹا سا قلعہ جسے اس نے پچیس سال کے صبر، اور محنت سے تعمیر کیا ہے۔ وہ مکان صرف اینٹوں اور سیمنٹ سے نہیں، قربانیوں اور امیدوں سے بھی بنا ہے۔ راشد مجھے اپنے گھر میں موجود پا کر گرمجوشی سے کہنے لگا:

”لاہور میں گزارنے والا ہر قدم مجھے یاد دلاتا ہے کہ میں کہاں سے چلا تھا۔“

اس بار بھی دسترخوان پر چاول تھے اور ہم دونوں کھانا کھانے میں مصروف تو خاموشی کے طویل وقفے کو میں نے اپنے ایک سوال سے توڑا:

”یہ ہر ماہ پچیس تاریخ کو چاولوں کی خیرات کیوں کرتے ہو؟“

وہ مسکرایا، مگر آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

راشد نے اپنی پلیٹ سے اٹھتی بھاپ کو یوں تکتے ہوئے کہا جیسے ماضی کی دھند میں کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔

”ایک وقت تھا جب ہر مہینہ کی پچیس تاریخ کو میرے پاس سب پیسے ختم ہو جاتے تھے۔ میں کسی دربار پر چلا جاتا، قطار میں لگ کر نیاز کے چاول حاصل کرتا تھا اور میری جیب خالی ہوتی تھی...... یہ سب میری تنہا شاموں کے ساتھی تھے۔“

اس نے چمچ سے چاول اپنے منہ میں ڈالے، جیسے یادوں کو اپنے چمچ سے کھینچ کر پلیٹ سے باہر نکال رہا ہو۔

”اب اللہ نے بہت کچھ دے دیا ہے تو سوچا، جن دنوں میں نے مانگا، انھی دنوں میں دوں۔“

میں خاموش تھا۔

چاولوں کی خوشبو میں شکر کا احساس گھلا ہوا تھا۔

راشد کے شکرانے کے چاول صرف ایک رسم نہیں، بل کہ اس کے دل میں بھی اُبلنے والا وہ گہرا احساس تھا۔

☆☆☆☆☆

خالد نذیر

......لوپ (LOOP)...... (مائکروف)

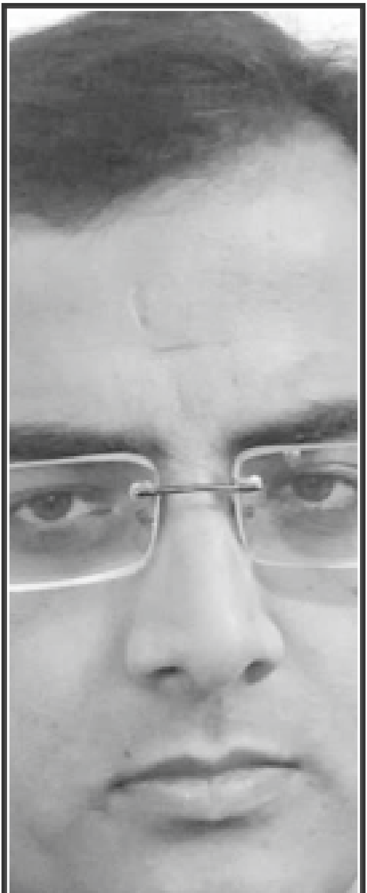

حامد حسن

"اسے پھر بچا لیا گیا---!"

"یہی تو اصل داستان ہے ابرار بھیا--- وہ طبعی موت کے علاوہ مر ہی نہیں سکتا---"

"لیکن--- ایسا کیوں؟"

"اگر آپ کو یاد ہو تو جنگ کے دوران دھماکے سے ناشاد کی کھوپڑی کا کافی سارا حصہ اڑ گیا تھا۔ چونکہ اس کا دماغ محفوظ تھا اس لیے، اس کی دونوں ٹانگوں کے ساتھ ساتھ اس کی کھوپڑی بھی دھاتی پلیٹوں کی مدد سے بنا دی گئی۔"

"یہ تو ہے ڈاکٹر--- لیکن---" جملہ ادھورا چھوڑا گیا---

"اب یہ اتفاق ہے یا پھر فوجی ہونے کے ناطے رغبت کہ ناشاد خودکشی کے لیے ہمیشہ کنپٹی پر فائر کرتا ہے---"

آخر انسانیت کا سب سے پہلا قاتل کون تھا؟

کون تھا کہ جس نے انسانیت کو داغدار کرنے کی داغ بیل ڈالی؟

اور کون ہے جو آج بھی مسلسل انسانیت کی تذلیل کیے جا رہا ہے؟

زن، زر اور زمین تو بدنام ہی ہیں۔ یہ انسانی

سوچ ہی ہے جو فسادات کی ابتدا بنتی ہے اور انسانیت کے قتل پر منتج ہوتی ہے۔
کیوں بے ثباتی دنیا کا احاطہ کر چکی ہے کہ محض نفس کی تسکین جنسی بے راہروی، اور انا کی آبیاری ہوسِ انتقام کا باعث بن کر شیطانیت کو معراج دیتی ہے۔ جان لینے اور خون بہانے کا کام اب جدید ہو گیا ہے۔ اب جسم کے ٹکڑے اڑتے اور اعضا کی دھجیاں بکھرتی ہیں۔ 'جسم' کے نام پر گٹھڑیوں میں قیمہ ملتا ہے۔
دائیں جانب خون آلود جسموں کے ڈھیر، بائیں جانب پچکی، ٹوٹی پھوٹی اور بکھری ہوئی گاڑیوں کے ٹکڑے اور سامنے سیاہ و سرخ گوشت و دھاتی ٹکڑاجات کے ملغوبے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر رہے تھے۔
چپڑ چپڑ کی آوازوں کے ساتھ سرخی مائل سیال مادہ اس کے قدموں کے نیچے انسانیت کی مظلومیت کی داستان دہرا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں جنگ کا وہ زمانہ گھوم رہا تھا کہ جو ماضی میں برتری کے اظہار کے لیے لڑی جاتی رہیں۔ آج ویسا ہی منظر 'جنت' کے حصول کی خاطر حالیہ دھماکے کی صورت میں دنیا کے سامنے تھا۔
وہ لاشوں کے اس انبار سے اب تک سولہ جاں بہ لب اجسام اٹھا کر مسیحاؤں کے حوالے کر چکا تھا اور اب مزید کو کھوج رہا تھا۔

اچانک اس کے مشینی قدم تھم گئے۔
کسی کار کے ٹوٹے ہوئے دروازے کے نیچے ایک لہولہان نسوانی پیکر کپکپا رہا تھا۔ خوں رنگ لباس، چہرے پر منجمد اذیت، پپوٹوں میں بمشکل خلا پیدا کر کے لرزتے ہوئے ہاتھ کو اٹھا کر وہ اس سے مخاطب ہوئی۔
''میری ٹانگیں میرے ساتھ نہیں ----''
دروازے کے نیچے بنا خون کا تالاب اس کی کٹی ہوئی ٹانگوں کا ثبوت دے رہا تھا۔ ''وہ بھی مشینی انسان تھا--- اس کا دھاتی پاؤں میرے شانے اور سر میں لگا--- مجھے مر جانے دو--- میں 'مشینی انسان' نہیں بننا چاہتی--- مجھے مار دو-----!'' متعدد ٹکڑوں میں بٹے ان جملہ جات نے اسے اپنی 'مشینی' حیثیت کا احساس دلایا اور لڑکی کے آپس میں جڑے ہاتھ، پھیلے دیکھ کر اسے ندامت اور احساسِ جرم نے جکڑ لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ لڑکی کو کچھ کہتا لڑکی بے جان ہو گئی۔
اس کا 'دھڑ' کپکپایا، مشینی ٹانگوں نے دماغ سے آئے حکم کے بموجب اس کے انسانی دھڑ کو پوری رفتار کے ساتھ اٹھایا اور ایک زوردار دھماکے کے ساتھ دیوار میں پیوست کر دیا۔
ناشاد بچا لیا گیا ---- اسے پھر بچا لیا گیا---

☆☆☆☆☆

سر کا سائیں...... (مائکروف)

میری ماں...... بہت بزدل اور ڈرپوک...... شاید اس نے زندگی میں صرف خوف کو ہی محسوس کیا اور اسی کے زیرِ سایہ اپنی زندگی گزار دی۔

میرا باپ...... جب سے میں نے ہوش سنبھالا اسے ماں کے لیے نہایت سنگدل اور کرخت پایا۔ اس کی شخصیت میں کہیں بھی جمال نہ تھا اور ماں سراپا نور اور مجسم حسن......

باپ کو لگتا تھا کہ وہ سر پر نہ چڑھ جائے۔ وہ ڈراتا رہا اور وہ سہمی سہمی رہنے لگی۔ اور پھر دونوں اس مزاج میں ڈھلتے چلے گئے۔ میں نے بچپن سے سیکھا کہ چلانے میں طاقت ہوتی ہے تو میں نے بھی زور سے بولنا شروع کردیا۔ وہ جو پہلے ایک سے خوفزدہ تھی اب میری چیخ و پکار سے اسے دہرے عذاب کا سامنا کرنا پڑتا۔

مجھے اس پر ترس نہیں آتا تھا۔ کیونکہ میں ماں کے رویے کو اس کی شخصیت کا حصہ سمجھ بیٹھا اور مجھے وہ ڈری سہمی بظاہر ٹھیک نظر آتی تھی۔

لیکن ایک رات وہ اندھیرے کمرے میں شاید کسی ڈراؤنے خواب کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ وہ زور زور سے چلائی--- میرا باپ پہلی مرتبہ سہا ہوا نظر آیا۔ ماں مسلسل اس کے سینے پر سر رکھ کر خود کو معمول میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس دن مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ان دونوں نے اپنے اپنے اوپر خول چڑھا رکھا ہے۔ میں نے ماں سے اونچی آواز میں پوچھا کہ تو اس آدمی سے ہمیشہ خائف نظر آئی۔ لیکن جب پناہ ڈھونڈی تو اس انسان کے سینے میں ہی پیوست ہو کر---

وہ کہنے لگی جیسا بھی ہے میرے سر کا سائیں ہے۔ ڈراؤنے خواب کی دہشت اس کے سینے سے لگ کر ہی دور ہوئی۔

عامر انور

میں نے پوچھا کہ کیا خواب حقیقی زندگی سے بھی ڈراؤنا تھا۔ وہ یہ سن کر چپ سی ہو گئی۔

لیکن اس دن سے میں نے بولنا شروع کر دیا۔ جب کہ اس سے پہلے میں صرف شور کرتا تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ ماں مظلوم نظر آئی۔ اس بدلاؤ نے ماں کے وجود کو میرے لیے مزید مشفق بنا دیا۔ اتنا شفیق کہ میں پگھلتا چلا گیا۔

اب باپ شور کرتا تو میں پہرے دار بن جاتا۔

آخر ایک دن اس کی بک بک سن کر میں نے اسے گھونسہ دے مارا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا اور اس میں سے خون ابل پڑا۔

میری ماں اسی طرح چلائی جیسے وہ ڈراؤنا خواب دیکھ کر چیخی تھی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ ماں کیا کھلی آنکھ سے بھی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے۔

اس نے میرے سینے پر دو تھپڑ مارے ---

اور جلدی سے اپنے دوپٹے سے باپ کے ہونٹ سے نکلے خون کو صاف کیا۔ وہ روتی جا رہی تھی اور بولتی جا رہی تھی کہ یہ جیسا بھی ہے میرا نگہبان ہے۔ میں اس کے ہوتے ہوئے نہیں ڈرتی۔

میں نے اب بولنا چھوڑ دیا تھا۔ باپ نے شہ پکڑی اور اپنی آواز کی قوت کو اور بڑھا دیا۔ ایک دن وہ اس شدت سے دھاڑا کہ ماں گر گئی۔ اس نے گرے ہوئے وجود پر پاؤں سے ٹھوکر ماری۔ وہ پہلی ٹھوکر تھی جس پر ماں نے سسکی نہ بھری۔ وہ ہر دکھ سے ماورا ہو چکی تھی۔

اس کی قبر ایک کونے پر واقع تھی جہاں دن میں بھی رات کا گماں ہوتا۔ اس کے دائیں طرف ایک قبر کی جگہ خالی تھی۔ ایک دن میں رات تک بیٹھا رہا۔ جانے لگا تو مجھے قبر سے خوفزدہ ماں کی آواز آئی۔ اسے قبر میں اندھیری رات سے خوف آ رہا تھا۔

میں نے اسے اپنا وہم جانا۔ لیکن مسلسل تین دن قبر سے خوفزدہ ماں کی آواز آتی رہی۔

میں اسے بہت تسلی دیتا کہ وہ نہ ڈرے ---

لیکن وہ بہل نہیں رہی تھی ---

اور پھر اس کے ساتھ والی خالی جگہ کو میرے باپ کی میت نے پر کر دیا۔ اب میں رات کو ان کی قبروں سے اٹھ کر جاتا ہوں تو ماں ڈرتی نہیں۔ وہ سچ کہتی تھی کہ باپ جیسا بھی تھا اس کے سر کا سائیں ہے۔ وہ اس کی موجودگی میں خود کو محفوظ تصور کرتی ہے۔

میں اب رات کو سوتا ہوں تو کانوں میں روئی ٹھونس لیتا ہوں ورنہ مجھے باپ کی تڑپتی سسکتی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس نے اپنے منہ پر سے تکیہ ہٹانے کی بہت کوشش کی تھی۔

☆☆☆☆☆

غزل

بچشمِ تر ندامت جاگتی ہے
یہاں گلیوں میں خلقت جاگتی ہے

کسی کو خواب کی ہمت نہیں تھی
مرے گھر میں مصیبت جاگتی ہے

دلوں میں وسوسے پیدا ہوئے ہیں
نجانے کب قیامت جاگتی ہے

مقدر سر بسر ہے سونے والا
مرے مولا کی رحمت جاگتی ہے

میں گھوڑے بیچ کر سوتا رہوں گا
مری خاطر عدالت جاگتی ہے

کہاں لے جائے ہم سوئے ہوؤں کو
جو دریاؤں کی شدّت جاگتی ہے

دھماکے پر دھماکا ہو رہا تھا
بمشکل یہ حکومت جاگتی ہے

کوئی رنجش نہیں آپس میں ثاقب
تہِ دل جب محبت جاگتی ہے

آصف ثاقب

غزل

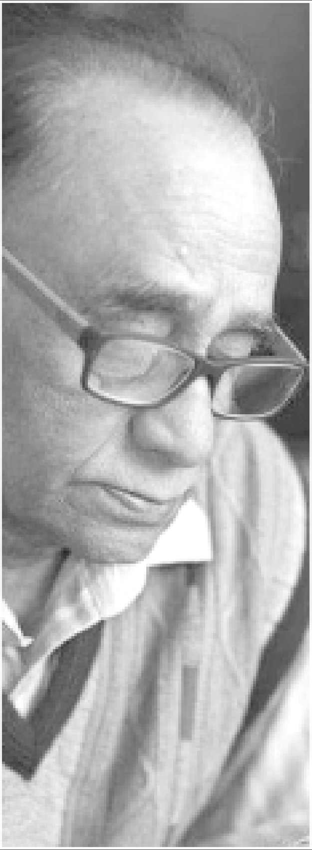

اپنا جہان ہم نے خود ایجاد کر لیا
وحشتِ خیال میں چمن آباد کر لیا

یاد اُس کی چھوٹ پائے تو سمجھیں کہ واقعی
ہم نے اب اپنے آپ کو آزاد کر لیا

بھٹکے اگر کہیں تو وہیں راہ پوچھ لی
جو اُٹھ گیا غلط ، وہ قدم صاد کر لیا

ہم نے تو بندِ غم سے رہائی کی فکر میں
کچھ اور اپنے آپ کو ناشاد کر لیا

باہر کہاں نصیب یہ آرام تھا ہمیں
جو ہم نے تیری قید میں صیاد کر لیا

ہمراہ لا سکے نہ جسے اے شعور! ہم
دل میں بسا لیا اُسے ہمزاد کر لیا

انور شعور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چاند کیا جل بجھے ستارے بھی
ہو گئے خوں یہ استعارے بھی

غزل

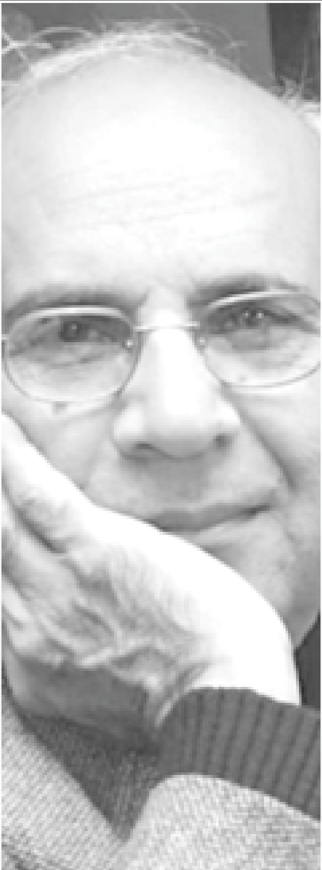

شام و سحر کے کھیل میں ہم مختار بھی ہیں مجبور بھی ہیں
عمر کی دھوپوں چھاؤں میں رنجور بھی ہیں مسرور بھی ہیں

کچھ سانجھے موسم ہیں ہمارے اور کچھ اپنی اپنی رُتیں
رنگ بدلتی دنیا میں ہم پاس بھی ہیں اور دُور بھی ہیں

دیدہ و دل میں جتنا سمائے اُس سے کہیں زیادہ ہے
ظاہر کے دس ظاہر ہیں، مستور کے سو مستور بھی ہیں

باغِ حیات کا موسم بھی بس خوف و خواب کا موسم ہے
آندھی کے آثار بھی ہیں پیڑوں پر تازہ بُور بھی ہیں

سو ہزار ہوئے ہوں گے جو اُس کا کرم درگزرے گا
خود بھی معاف نہ کر پائیں گے ایسے بڑے قصور بھی ہیں

آنکھیں سپنوں کی تعبیروں سے پھر بھی مایوس نہیں
غیروں کے بھی گھیرے میں ہیں اپنوں کے محصور بھی ہیں

کیسے کیسے صحرا چھان کے سبز نواح تلک پہنچے
دل سرشار ہوئے جاتے ہیں جسم تھکن سے چُور بھی ہیں

عالی طرزِ سخن میں ہم نے ایسی راہ نکالی ہے
کچھ کوچوں بدنام بھی ہیں کچھ حلقوں میں مشہور بھی ہیں

جلیل عالی

غزل

یہ کرم بھی اس کا ہے ، اس کی مہربانی ہے
درد ہے تو آنسو ہیں ، پیاس ہے تو پانی ہے

کچھ سمجھ نہیں آتا ، کس طرف نکلنا ہے
اک طرف ہے ٹھہراو، اک طرف روانی ہے

اے شعور! طے کرلیں، کس طرح گزاریں گے
اک حیات لافانی ، اک حیات فانی ہے

اس حیات فانی میں، اک شکست دل کے سوا
رائیگاں ہے میرے لیے، جتنی رایگانی ہے

بے جہت اشاروں پر، چل رہی ہے چپکے سے
ہجر کی روایت کا ، رنگ داستانی ہے

اے خدائے حشر ہمیں ، چیخنا نہیں آتا
ایک چشم گریہ ہی اپنی ترجمانی ہے

نفرتوں کی صورت میں وہ پلٹ کے آتی ہے
ظلم کے تصرف میں جتنی بدزبانی ہے

کون دیکھتا ہے کنور ، قہقہوں کا خالی پن
ہنستے بستے لوگوں کی ، ایک سی کہانی ہے

اعجاز کنور راجہ

غزلیں

اِک دشت میں غزال نے رَم رَم سخن کِیا
خوش رُو و خوش خیال نے چھم چھم سخن کِیا

اک جلترنگ سی بجنے لگی میرے چارسُو
اِس ڈھب سے، اِس ادا سے اُسے ہم سخن کِیا

پروانے جل مرے اُسے دیکھ دیکھ کر
لَو سے دِیے نے شب کو جو پیہم سخن کِیا

اِک بات نے کِسی کی اُداسی بکھیر دی
اِک یاد نے کِسی کی سرِنَم سخن کِیا

چاروں طرف اُسی کی صدائیں سنائی دیں
حالاں کہ اُس کی آنکھ نے کم کم سخن کِیا

لوبان جل اُٹھے ہیں ہواؤں کے باوجود
فرقت کدے میں کِس نے یہ پُرنم سخن کِیا

شاہِ نجفؑ نے اُس پہ عنایت اُتار دی
جب بھی کسی ملنگ نے دَم دَم سخن کِی

نثار ترابی

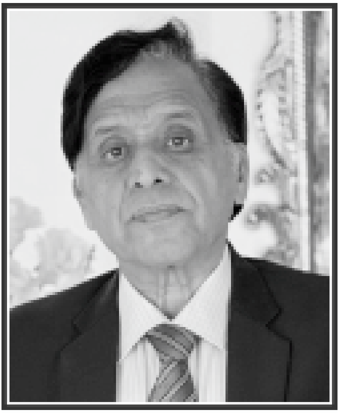

گزرتی رُت کی نشانی میں چل کے آیا تھا
یہ زخم اپنی روانی میں چل کے آیا تھا

نظر پڑی تو کسی اور داستاں میں مِلا
مَیں جس کے ساتھ کہانی میں چل کے آیا تھا

بہا رہا تھا کوئی پھول خشک دریا میں
وہ ایک شخص جو پانی میں چل کے آیا تھا

نہ کارواں کا نشاں تھا، نہ دشت میں خیمے
شجر تو بچھڑی جوانی میں چل کے آیا تھا

تلاشِ روح کی محنت بھی رائیگاں ہی گئی
بدن بھی شکل پرانی میں چل کے آیا تھا

اک آئینے کے مقابل تھے آئنے کتنے
سو عکس نقل مکانی میں چل کے آیا تھا

اُسے بھی شب کے فسوں نے جکڑ لیا آخر
کبھی جو شام سُہانی میں چل کے آیا تھا

غزل (ولی دکنی کی نذر)

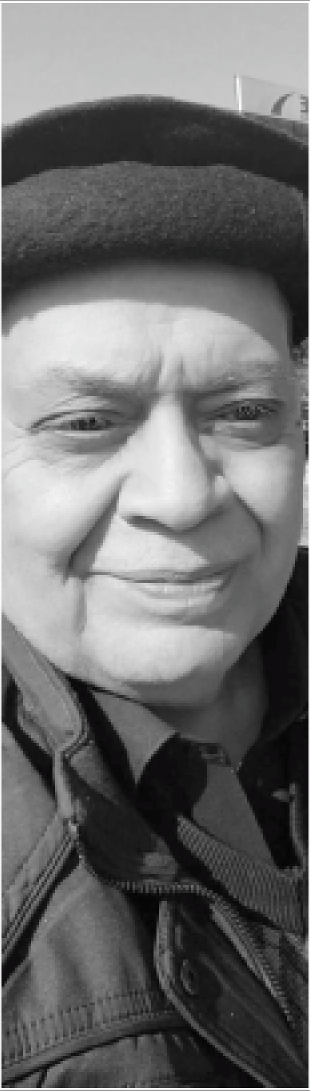

حیرتیں ختم بھی کر، دیدۂ حیران میں آ
تو پری زاد نہیں ہے تو مرے دھیان میں آ

تو مرے شعر ذرا سوچ کہ نازک ہے یہ کام
میرؔ کے پاؤں کو چھو پھر مرے دیوان میں آ

کیسے برباد کرے ہے ترے عشاق کو یہ
کیسی مسکان لبی چاہِ زنخدان میں آ

سامنے ہوں گے عجب حشر کے منظر تیرے
تو کبھو شام سے اس دلِ ویران میں آ

چپ اکیلے میں ہوں لیکن میں چہکتا ہوں بہت
دیکھنا ہو تو مرے حلقۂ یاران میں آ

بزم میں تیری کہاں بات کا یارا جاناں
کوئی بولے تو پڑے قہر کے زندان میں آ

جب کرے مجھ سوں کبھو جان مری، پیار کی بات
بیٹھ جاتا ہے مرا دل بھی مرے کان میں آ

ناصر علی سید

غزل

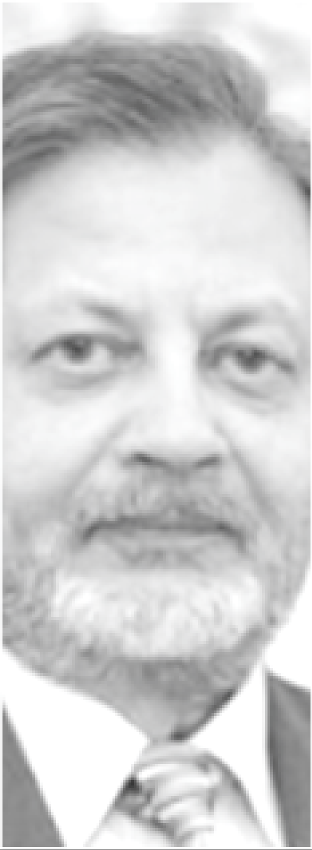

دیکھنے میں تو کسی تیر نہ تلوار کا مَیں
رہ گیا ہُوں فقط اب درہم و دینار کا مَیں

کھینچ کر لے گئی اِک موجِ بلا خیز مجھے
پھر نہ ساحل کا رہا اور نہ منجدھار کا مَیں

رُوح میں آج بھی ہنگامہ بپا ہے لیکن
کیا کروں جسم کی گرتی ہُوئی دیوار کا مَیں

گھوم پھر کر اُسی قریے میں نکل آیا ہُوں
یعنی کشتہ ہُوا ہُوں اپنی ہی رفتار کا مَیں !

رات بھر کروٹیں لیتے ہُوئے گذری خاور
اِک ورق پڑھ نہ سکا شام کے اخبار کا مَیں

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عشق کا فخر نہیں، یکسر و یکتا ہونا
عشق ہے سب سے الگ ہو کے بھی سب سا ہونا

غزل [قیصر الجعفری کی زمین میں]

وہ خدا تھا خدا رہا برسوں
میں بھی محوِ دعا رہا برسوں

جا رہا تھا وہ چھوڑ کر مجھ کو
اور میں دیکھتا رہا برسوں

اس کو دیکھا تھا ایک بار مگر
آئنہ ٹوٹتا رہا برسوں

منزلوں کی طلب نہ تھی باقی
سامنے راستہ رہا برسوں

تیرے آنے سے جل اٹھا خود ہی
اک دیا جو بجھا رہا برسوں

اب مرا نام پوچھتا ہے مجھے
جو مرا آشنا رہا برسوں

مرحلہ وار ہم نے عشق کیا
اور یہ سلسلہ رہا برسوں

عمر بھر ساتھ چلتے رہے
پھر بھی اک فاصلہ رہا برسوں

روز وہ دل کو توڑ دیتا تھا
اور میں جوڑتا رہا برسوں

باقی احمد پوری

غزلیں

سناٹا جب چیخ رہا تھا
سرگوشی سے ڈر لگتا تھا

جب جینے کی آس بندھی تھی
میں اندر سے ٹوٹ گیا تھا

یارب! اس نے کیا نہیں مانگا
تیری رضا جو مانگ رہا تھا

تشنہ دہن تھا اک مشکیزہ
پاس کوئی دریا بہتا تھا

ماں کی ڈھیر دعائیں لے کر
رات گئے میں گھر آتا تھا

میرے منہ میں بات بڑی تھی
لیکن میرا قد چھوٹا تھا

ڈوب چکی جب ایک اک بستی
دریا نے رُخ موڑ لیا تھا

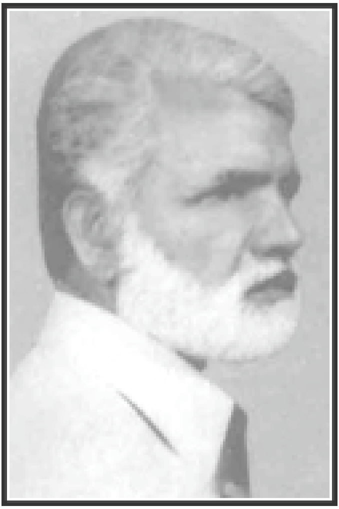

یعقوب پرواز

پھولوں کا کردار سمجھ میں آتا ہے
خوشبو کا معیار سمجھ میں آتا ہے

اب اُس سے اصرار کروں کس برتے پر
جب اس کا انکار سمجھ میں آتا ہے

ذہن بدل کے رکھ دیتا ہے پل بھر میں
آتا ہے زردار سمجھ میں آتا ہے

حصوں کی تقسیم معین ہو جس میں
ایسا ہر بیوپار سمجھ میں آتا ہے

دل کی آنکھیں کھلی رہیں پرواز اگر
ہر عقدہ دشوار سمجھ میں آتا ہے

غزل

شوخ ہوا نے لی انگڑائی
جب تو نے چنری لہرائی

شریانوں میں جذبے جاگے
دل گلشن میں رت گدرائی

پتے کلیاں تتلی بھنورے
جیسے زیست پلٹ کر آئی

چگ چگ تیری پائل چھنکی
وجد میں بالی بالی آئی

کس بنسی نے پیار دیا ہے
کن ہونٹوں نے تان لگائی

اس کے پیار کو پا کر ثاقب
دانا ہو جائے سودائی

منظور ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مری بات کہتے رہنا ، یہ قلم اُٹھائے رکھنا
یہ علم فرو نہ کرنا ، یہ فلک سجائے رکھنا

غزل

مجھ کو نیلی دھار لگے ہے
جو اپنا غم خوار لگے ہے

ظلم کے سائے میں جو گزرا
وہ جیون بیکار لگے ہے

قائد کی تصویر لگا کر
رشوت کا بازار لگے ہے

بولو جھوٹ اور اتنا بولو
سچ کہنا دشوار لگے ہے

بچنا ناممکن ہے یارو
جب اپنوں کا وار لگے ہے

ہم کو اپنے عشق کی منزل
سات سمندر پار لگے ہے

یاروں کی باتوں میں اکثر
سانپوں کی پھنکار لگے ہے

گرگٹ جیسا رنگ بدلتا
ہر لیڈر فنکار لگے ہے

خودغرضی کے بھیس میں لپٹا
نفرت جیسا پیار لگے ہے

ہر غنچہ ہر کھلتا گُل اب
تیرا لب و رخسار لگے ہے

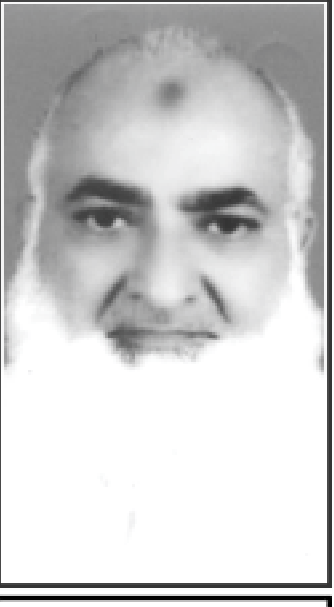

عقیل رحمانی

غزل

عادی قفس کی ذلتِ آرام کے نہیں
ہم پالتو پرندے ترے بام کے نہیں

پھر بھی بہت ضروری ہے اپنوں سے بات چیت
مانا کہ ہم تمھارے کسی کام کے نہیں

مہتابِ ے نکلنے میں کچھ دیر ہے ابھی
چمکے افق پہ تارے ابھی شام کے نہیں

میں نے تمام عمر مرے دوست سوچ لے
چھوڑا کسی کا ہاتھ کبھی تھام کر نہیں

ایسوں کو بھی سنانی پڑی آسماں کی بات
معنی بھی اپنے جن کو پتا نام کے نہیں

اس کی حسین آنکھوں میں راحت ہے وہ مقام
جو راستے میں گردشِ ایام کے نہیں

راحت سرحدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

در بہ در گریہ کناں، طالب درماں کیوں ہیں؟
تیرے عشاق گرفتارِ غمِ جاں کیوں ہیں؟

غزلیں

رنج، دل پر جو بے نشاں ٹھہرا
دلربا ٹھہرا، دل ستاں ٹھہرا

طاقِ نسیاں نہ رکھ سفر دل کے
رہ گزر، رہ گزر، نشاں ٹھہرا

دل کو اپنے، سرائے دہر سمجھ
آنے والوں کو، بے گماں ٹھہرا

منکشف ہے گا، اپنی وحشت کو
دل، کہ اک دشتِ بے کراں ٹھہرا

شوق گرداں، کی ہمرکابی کو
ایک سے ایک، کارواں ٹھہرا

تو نے جانا، ترے فسانے بھی
اک گھڑی، رنگِ داستاں ٹھہرا

جڑ سے پھل تک ہو تختۂ ارژنگ
جس شجر لطفِ باغباں ٹھہرا

رنگا رنگی میں ہر زمانے کی
اک وہی رنگ جاوداں ٹھہرا

ہم جو رنگے گئے ہیں رنگ ترے
اب یہی رنگِ سادگاں ٹھہرا

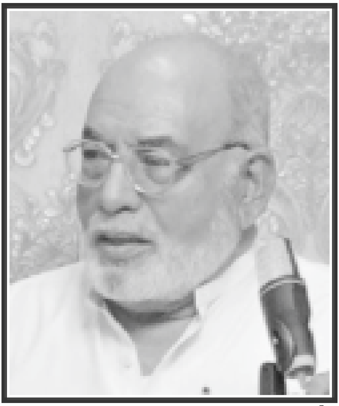

طارق بٹ

میں عرضِ خواب سے، پیکر کئی اٹھا رہا ہوں
نظر کی دھوپ، نئے منظروں پہ لا رہا ہوں

یہ وقت مجھ پہ بڑا صبر آزما گزرا
میں اپنی گھڑیاں نئے وقت سے ملا رہا ہوں

لگی ہے عمر مری، اپنے ہی تعاقب میں
کہیں میں راست، کہیں خود کو ورغلا رہا ہوں

یہ لوگ بوجھ ہوئے مجھ پہ اور میں ان پر
اٹھائے جاؤں کہاں تک، گرایا جا رہا ہوں

یہ نقش اور بنے جاتے ہیں، مٹانے سے
میں کب سے بیٹھا انھیں خاک میں ملا رہا ہوں

ڈرو نہیں، جو حقیقت ہے اور، خواب ہے اور
یہ آنکھوں دیکھی ہے میری، تمھیں بتا رہا ہوں

نظر میں رکھنا کھنڈر ہوتی سطوتوں کے نشاں
میں کہہ رہا ہوں یہ کب سے، تمھیں جتا رہا ہوں

غزل

اداسی اس قدر گھمبیر نکلی
ہماری ہو بہو تصویر نکلی

بھروسہ کر لیا تھا زندگی پر
مگر وہ بھی قضا کا تیر نکلی

میں اس کو چھوڑ بھی سکتا تھا لیکن
محبت پاؤں کی زنجیر نکلی

لب و لہجے میں شیرینی غضب کی
مگر کڑوی بہت تاثیر نکلی

ادھر وہ بھی مری کرنی کا پھل تھا
ادھر یہ بھی مری تقدیر نکلی

جنازے کی طرح سج دھج کے آخر
ہماری عزت و توقیر نکلی

ہمیشہ آسماں کا خواب دیکھا
مگر پاتال میں تعبیر نکلی

وسیلہ بن رہی ہے مغفرت کا
دواؤں سے دعا اکسیر نکلی

نشانہ باندھ کر پھینکی جب اس نے
چھری کے پھل سے کیا تکبیر نکلی

لہو نکلا بھی تو آنکھوں سے نکلا
کہاں ہم سے وہ جوئے شیر نکلی

کسی کے نام پر نکلا لفافہ
کسی کے نام وہ تحریر نکلی

سپیدۂ سحر تک جاگنا تھا
مگر دن میں بڑی تاخیر نکلی

اسے تو ڈھال میں ڈھالا گیا تھا
مگر وہ برہنہ شمشیر نکلی

بھسم ہو کر سراسر رہ گیا ہوں
انا بھی موئے آتش گیر نکلی

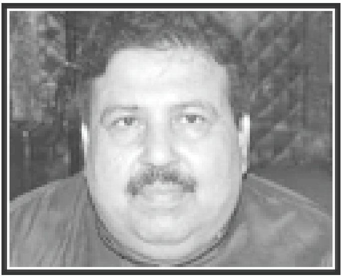

مسعود احمد

غزل

کس توقع پہ دل مچلتا ہے
آگ ہو تو دھواں نکلتا ہے

اک دریچہ ہے گزرے وقتوں کا
اس میں اب بھی چراغ جلتا ہے

خستہ منڈیر گر چکی کب کی
دل مگر آج تک دہلتا ہے

ایک منظر ہے صحن سے چھت تک
دھوپ کے ساتھ رخ بدلتا ہے

پھول یہ پوچھنے کو آئے ہیں
وہ ہتھیلی پہ کیا مسلتا ہے

کیا بتاؤں کہ رات بھر دل کی
موم بتی میں کیا پگھلتا ہے

صرف اک یاد پر نہیں موقوف
دکھ کئی زاویے بدلتا ہے

زینہ وہ احتیاط سے اترے
پھر بھی آنچل کہاں سنبھلتا ہے

ایک سایا سا پچھلے کمرے میں
نت نئے پیرہن بدلتا ہے

چاند کتنا عجیب ہے طالب
چاندنی رات میں نکلتا ہے

طالب انصاری

غزل

کچھ ایسے حیرانی کو تقسیم کیا
مُشکل سے آسانی کو تقسیم کیا

شعر کہے اور رونے کی آواز سُنی
میں نے نوحہ خوانی کو تقسیم کیا

تیز ہوا سے ٹُوٹ گیا پر پنجرے نے
اندر کے زندانی کو تقسیم کیا

ساتھ پڑے تھے لاشے، آنسو سونپ دیے
میں نے آنکھ کے پانی کو تقسیم کیا

خوشبو نم آلود ہوئی تو پھولوں نے
گلشن کی ویرانی کو تقسیم کیا

نقشِ اول آنکھ دِکھانے والا تھا
میں نے نقشِ ثانی کو تقسیم کیا

آدھا جینا آدھا مرنا سیکھ لیا
اُس نے دشتِ فانی کو تقسیم کیا

شاہِ وقت کا چہرہ بھی تقسیم ہوا
جب قصرِ سُلطانی کو تقسیم کیا

موجوں نے رستہ بدلا اقبال میاں
دریا کی طغیانی کو تقسیم کیا

اقبال سروبہ

غزل

حیرتِ عکسِ گماں ہے مجھ میں
آئینہ ہے تو کہاں ہے مجھ میں

اس قدر رائگاں میں ہوں تو نہیں
جتنا احساسِ زیاں ہے مجھ میں

کوئی اُٹھے نہ جگہ سے اپنی
وہیں بیٹھے جو جہاں ہے مجھ میں

خُود پہ خُود طعنہ زنی کرتا ہوں
میرے دُشمن کی زُباں ہے مجھ میں

نئے گھر میں نہیں رہنے دیتا
جو پُرانا سا مکاں ہے مجھ میں

اِک طرف آگ دہکتی دِل میں
اِک طرف آبِ رواں ہے مجھ میں

واجد امیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ثانی تمازتوں میں بھی اُس کا کوئی نہ تھا
وہ شخص تیرگی میں فقط روشنی نہ تھا

غزل

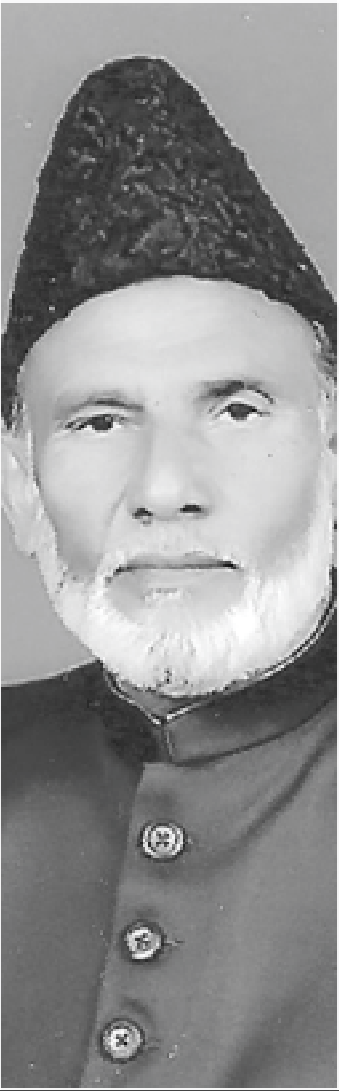

کرنے کو وسعتِ دریا کا نظارا اکثر
کر لیا ہم نے کناروں سے کنارا اکثر

دار پر شوق نے شدت سے پکارا اکثر
ہو گیا راہ میں حائل وہ سہارا اکثر

اک نظر اس کی اُچٹتی ہوئی پا لوں خود کو
آنکھ کے آئنہ خانے میں سنوارا اکثر

شاید آ جائے کوئی یاد نبھا کا وعدہ
اس کے ہر گام میں دامن کو پسارا اکثر

دل یہ بولا کہ تغافل پہ نہیں گھبراتے
ترکِ الفت پہ رویے نے ابھارا اکثر

دے دیا ہم نے سکوں، دل کی خوشی، صبر و قرار
یوں ترے حسن کا صدقہ ہے اتارا اکثر

ابتدا ہے بچو، بچ جاؤ محبت سے میاں
اچھے اچھوں کو بھی پٹخا کے ہے مارا اکثر

ہر کٹھن وقت درِ مصطفی کو یاد کیا
ساجد اس در کے لیے دل نے اُبھارا اکثر

شریف ساجد

غزلیں

دیا آندھی میں جلتا جا رہا ہے
اندھیرا ہاتھ ملتا جا رہا ہے

یہ کس منزل کے راہی چل پڑے ہیں
ستارا ساتھ چلتا جا رہا ہے

تمھارے چاند روشن ہو گئے ہیں
مرا سورج جو ڈھلتا جا رہا ہے

چمن کی سیر کو آیا تھا لیکن
وہ کلیوں کو مسلتا جا رہا ہے

مری آنکھیں بھی بوڑھی ہو چلی ہیں
ترا جوبن بھی ڈھلتا جا رہا ہے

ذرا سا آپ کیا بدلے ہیں شاہد
زمانہ ہی بدلتا جا رہا ہے

افتخار شاہد

محبتوں کو جو وہم و گماں سمجھتا ہے
وہ آسماں کی بلندی کہاں سمجھتا ہے

وہ جس کو میر کا مصرعہ سمجھ نہیں آتا
اسے یہ زعم ہے اردو زباں سمجھتا ہے

ہمارے زخم کی گہرائی ماپنے والا
جبینِ وقت کے سارے نشاں سمجھتا ہے

رہِ وفا کے مسافر سے بس یہی پوچھو
وہ سرخ، سبز یا پیلا نشاں سمجھتا ہے

ہماری بات جو تم کو سمجھ نہیں آئی
ہماری بات زمانہ کہاں سمجھتا ہے

وہ آشنائے حقیقت بھی ہو نہیں سکتا
جو خواب دیکھنا کارِ زیاں سمجھتا ہے

نشانے باز تھا خود بھی اسی لئے شاہد
نظر کو تیر، کمر کو کماں سمجھتا ہے

غزل

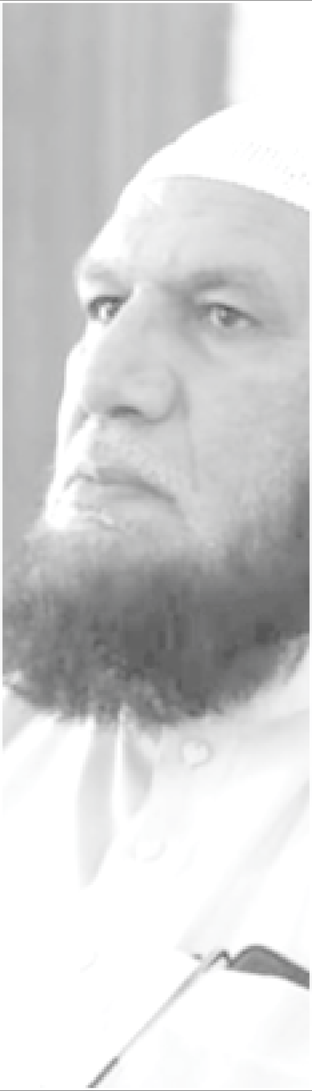

دکھ عشق میں اس دل کو نہایت ہی ہوا ہے
لیکن جو ہوا حسبِ روایت ہی ہوا ہے

ہر اشک ہے اک آئنۂ علم و بصیرت
یہ درد کا تحفہ بھی عنایت ہی ہوا ہے

چند ثانیوں میں ہیرے جواہر نہیں بنتے
پتھر میں حسیں رنگ سرایت ہی ہوا ہے

وہ دشمنِ جاں تھا تو کہاں ایسا گماں تھا
اب دوست ہوا دل کا تو غایت ہی ہوا ہے

الجھا ہوا کانٹوں میں ہے یہ مٹی کا پتلا
افلاک سے وہ ربط حکایت ہی ہوا ہے

دیوار بنائی گئی دیوار بھی اونچی
ہمسایہ بھی اب اپنا ولایت ہی ہوا ہے

احوالِ دلِ زار سے تو پاتا ہے تسکیں
بار اس پہ فقط حرفِ شکایت ہی ہوا ہے

وہ چشمہ کہ جو پھوٹا رضا دامنِ نبی سے
ہر قطرہ ہمارے لیے آیت ہی ہوا ہے

رضا اللہ حیدر

غزل

فلک پر چاند سورج سب ستارے بن رہے تھے
زمیں کہسار بحر و بر کنارے بن رہے تھے

میں اپنی خوش گمانی کے خزانوں سے بھرا تھا
کہیں پر جب خسارے پر خسارے بن رہے تھے

ابھی پہچان کے سب مرحلوں سے ہم ادھر تھے
مکمل کون تھا ہم لوگ سارے بن رہے تھے

میں جب نکلا تھا آنکھوں میں شکستہ خواب بھر کر
قیامت ٹوٹ پڑنے کے اشارے بن رہے تھے

کہیں پر نقش رکھے جا رہے تھے چاک پر جب
وہیں باہم شناسا دل ہمارے بن رہے تھے

میں جب تصویر کرنا چاہتا تھا تیری صورت
ستارے، کہکشائیں، استعارے بن رہے تھے

ہمیں تازہ ہوا کے فائدے سمجھا رہا ہے
ابھی تو ہاتھ تیرے تیز آرے بن رہے تھے

مری آواز غصہ حرف و نفرت کچھ نہیں تھا
کہیں ردِعمل میں سب ادارے بن رہے تھے

سلیم فگار

غزل

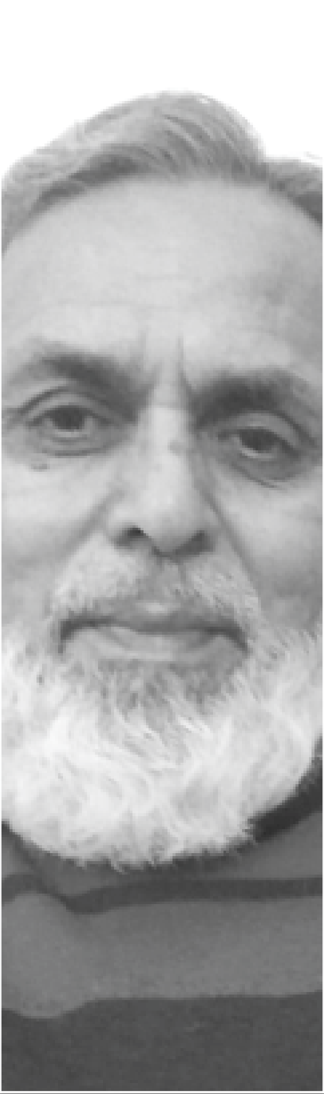

یہ کس کا ذکر چھڑا یادِ رفتگاں میں مری
کہ اک دھنک سی اُتر آئی داستاں میں مری

میں اِس زمین اور اِس آسماں کا حصہ نہیں
ہیں اور ارض و سما وسعتِ گُماں میں مری

دمِ سحر چلی جاتی ہو، خواب ٹوٹتے ہی
مدام رہتی ہو تم رات بھر اماں میں مری

نظر میں دُور تلک فصلیں لہلہاتی ہیں
ہے اب بھی رُوح مقیّد کسی کساں میں مری

یہ بند کوچہ، یہ چھوٹا سا گھر، یہ تنگ گلی
کٹی ہے عُمر اِسی ایک آشیاں میں مری

تمھیں فراغ نہ تھا، پس وہ اَن کہی باتیں
جو گفتنی نہ ہوئیں، بُجھ گئیں زباں میں مری

ہے میرا ایک تو گھر اس زمیں پہ جانِ انیس!
اور ایک جائے رہائش ہے آسماں میں مری

محمد انیس انصاری

غزلیں

اک عمر ایک بات سے دل بے خبر رہا
خوش قسمتی کے ساتھ سفر مختصر رہا

شاخیں مزید جھکنے پہ راضی نہ ہو سکیں
میں تھا سدا بہار مگر بے ثمر رہا

اس جستجو میں ہاتھ نہ آیا یقین بھی
یوں سرحدِ گماں کے اِدھر اور اُدھر رہا

باقی تو متن و معنی میں مبہم نہ تھے مگر
اک خط بلا تکلفِ زیر و زبر رہا

صحرائے شب کے پار بھی صبحِ سراب تھی
تعبیر کا فریب مرا ہم سفر رہا

اک عکسِ در نکھرتا رہا اس کے فیض سے
اک ماہ تاب آئنۂ بام پہ رہا

ہجرت بھی ناتمام سکونت بھی خام تھی
میں ایک در پہ رہتے ہوئے دربدر رہا

افتخار الحق

تمام عمر یونہی وقت سے جھگڑتا رہا
میں گرم خون سے اک سرد جنگ لڑتا رہا

مری زمین بتا کیا تھی مصلحت تیری
میں جڑ پکڑتے ہوئے کس لیے اُکھڑتا رہا

وہ جس کے اذن سے پھیلا رہا میں صدیوں پر
اسی کے حکم سے لمحات میں سکڑتا رہا

بھٹکتی رہ گئی تعبیر رت جگوں میں کہیں
دیارِ خواب سنورتے ہوئے اُجڑتا رہا

سمجھ میں وجہ نہ خیاطِ زخم کے آئی
لگا تھا کس کے جو ٹانکا وہ کیوں اُدھڑتا رہا

کبھی خیال کے قدموں کو دے دیا بوسہ
کبھی میں دامنِ الفاظ کو پکڑتا رہا

ہمیں سفر میں عجب ہم سفر ملا اب کے
ہمارے رستے میں رستا اک اور پڑتا رہا

غزل

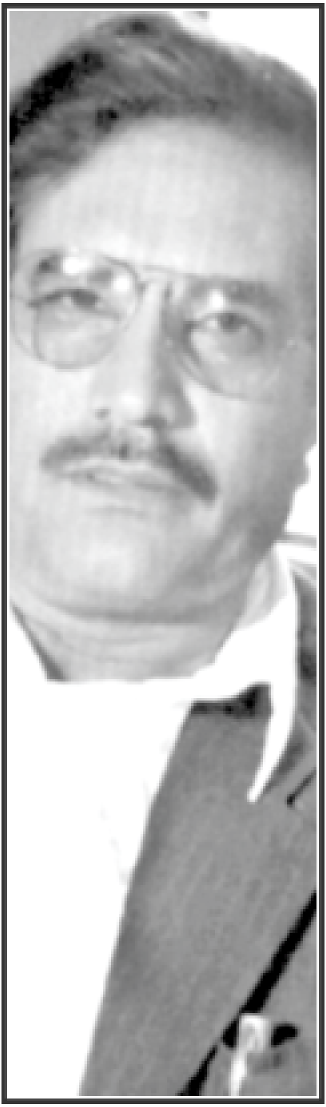

کوئی اچھا دکھائی دیتا ہے
عشق ہوتا دکھائی دیتا ہے

فصلِ گُل میں ، سب ایسے ویسوں کو
ایسا ویسا دکھائی دیتا ہے

کاش! تم بھی اُسی طرح دیکھو
مجھ کو جیسا دکھائی دیتا ہے

کوئی شے بھی بھلی نہیں لگتی
دل شکستہ دکھائی دیتا ہے

مجھ کو دیکھا تو یوں ہوئے گویا
یہ تو اپنا دکھائی دیتا ہے

عشق سودا جو سر میں ہو تو پھر
الٹا سیدھا دکھائی دیتا ہے

گلشنِ شوق آج بھی شوکت
ہنستا بستا دکھائی دیتا ہے

شوکت محمود شوکت

غزل

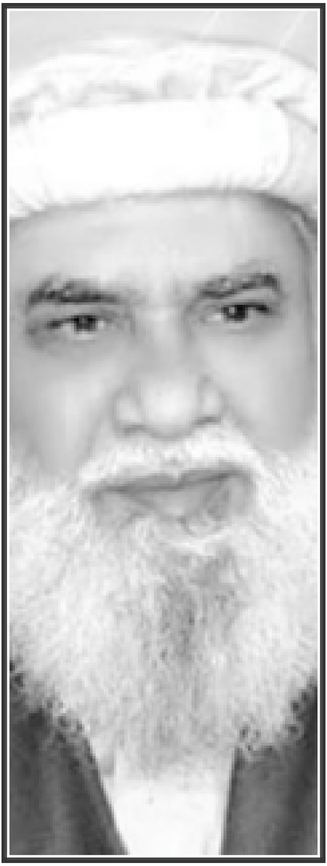

مجھے کسی نے نہیں آج تک سراہا کبھی
کوئی تو ہو جو کہے سن کے شعر، آہا، کبھی

کوئی تو نام پکارے، کبھی تو سائل کا
مرا بلاوا، ترے در سے آئے، شاہا کبھی

کوئی تو قیس ہو، مجنوں ہو، یا کوئی فرہاد
مری طرح سے، کسی نے کسی کو چاہا کبھی

کچھ اس طرح سے ہیں ازبر مدینہ کی گلیاں
بھلا سکا نہ کہیں پر کوئی دوراہا کبھی

اکرم ناصر

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

کم نظر روتے رہے ہم نظروں کا رونا
دیکھتا کون ترے دیدہ وروں کا رونا

غزل

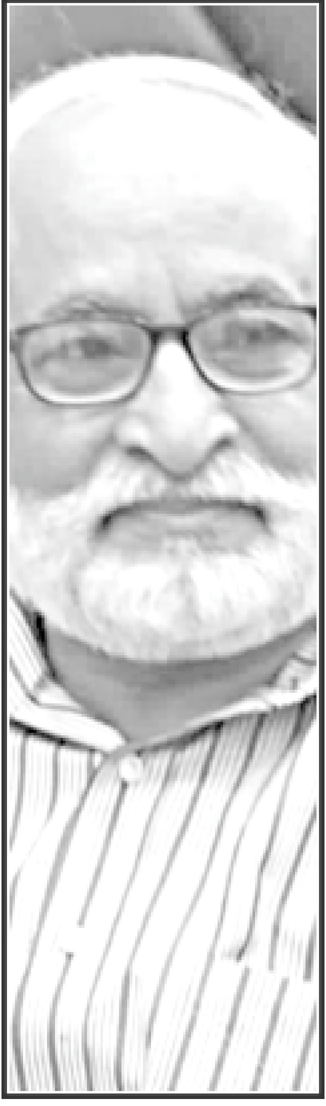

قلم نے کارِ ثواب سمجھا بہارِ نَو کا شباب لکھنا
اُداس آنکھوں کو جھیل لکھنا حسیں لبوں کو گلاب لکھنا

نظر کے منظر بدلتے رہنا سجا کے بزمِ خیالِ جاناں
ستارے لکھنا دمکتے آنسو دہن کو جامِ شراب لکھنا

ابھی تکلف ہے گفتگو میں ابھی محبت کی ابتدا ہے
نشانِ منزل کو دیکھتے ہی وہ چھوڑ دیں گے جناب لکھنا

سمجھ میں آئے اگر حقیقت تو زندگی کے ورق ورق پر
جہاں کو لکھنا غموں کا ساگر حیات مثلِ حباب لکھنا

وصال لمحے جب ایک لذّت انڈیل دیں روح جسم و جاں میں
تو وحشتِ فُرقت میں کٹنے والا ہر ایک لمحہ عذاب لکھنا

ملا نہ سچ میں نہ جھوٹ ہرگز قلم کا تم پر ہے قرض یہ بھی
نہ ریگزاروں کو دریا لکھنا نہ ساگروں کو سراب لکھنا

سحر جدائی کے رتجگوں میں وصال لمحے جو یاد آئیں
تو خونِ دل میں ڈبو کے پلکیں وفا کا رنگیں نصاب لکھنا

اکرم سحر فارانی

غزل

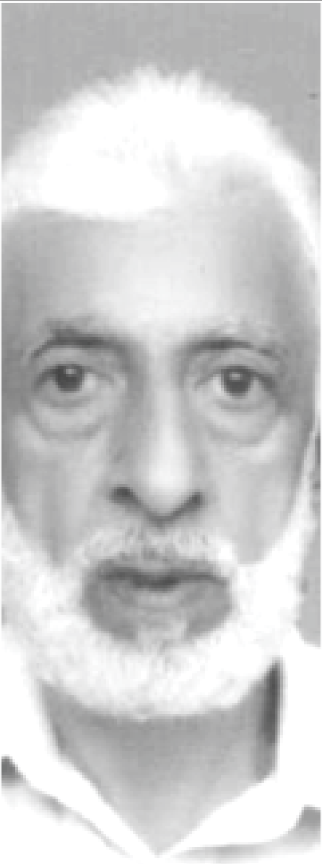

پھول کی تازگی کا چرچا ہے
شہر میں آپ ہی کا چرچا ہے

زندگی کے حسین لمحوں میں
حُسن کی سادگی کا چرچا ہے

ہر طرف شور ہے قیامت کا
ہر طرف خامشی کا چرچا ہے

اُس کا سینہ ہے شہرِ خاموشاں
جس کی زندہ دلی کا چرچا ہے

عشق کی ساری قتل گاہوں میں
بس مرے ضبط ہی کا چرچا ہے

شور ہے اُس کی بے نیازی کا
اور مری بے بسی کا چرچا ہے

کل بھی شہرت اُسی گلی کی تھی
آج بھی اُس گلی کا چرچا ہے

ذرّے ذرّے میں کون ہے شاہد
کِس کی جلوہ گری کا چرچا ہے

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

احمد جلیل

یہ مرحلہ تو چلو اختتام تک پہنچا
بجھا کے آگ میں سورج کی شام تک پہنچا

تمھارے شوق نے ہر مرحلہ کیا آسان
وگرنہ کون بھلا اس مقام تک پہنچا

کسی نے تو دیا ہم کو وفاؤں کا الزام
ہے شکر کوئی تو بے ننگ و نام تک پہنچا

گداز کوئی تو ہو گا جلیل پتھر میں
کہ سنگ اب بھی نہیں انتقام تک پہنچا

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

اہلِ زنداں کے لیے تازہ ہوا آنے کو ہے
شہرِ جاناں سے کوئی تازہ نوا آنے کو ہے

غزل

خود کو برائے درہم و دینار مت گرا
میرے تعلقات کا معیار مت گرا

ہے منفعت کے ساتھ جو نقصان اس کا سوچ
جو پیڑ ہو چکے ہیں ثمر بار مت گرا

فاقہ کشی کو سنت سمجھ کے قبول کر
نان و نمک کے واسطے کردار مت گرا

ہم نے کہا ہے تیرے غلط کو اگر غلط
غصے میں آ کے یوں در و دیوار مت گرا

ہر بار گر گیا وہ گراتے ہوئے صغیر
ہر بار میں یہ کہتا رہا یار مت گرا

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دم سادھ کے دیکھوں تجھے، جھپکوں نہ پلک بھی
آنکھوں میں سمو لوں، ترے لہجے کی دمک بھی

غزل

اصغر علی بلوچ

کبھی کبھی تو یہ دنیا پرانی لگتی ہے
سنی سنائی طلسمی کہانی لگتی ہے

میں جی رہا ہوں کہ جینا جہاں نہیں بنتا
مجھے تو یہ بھی تری مہربانی لگتی ہے

یہ گرد گرد سے چہرے پہ آنسوؤں کی نمی
کسی طویل سفر کی نشانی لگتی ہے

کوئی خیال ہے بہتے ہوئے گلابوں سا
کہ میری روح میں جس کی روانی لگتی ہے

اداس بام پہ رکھی ہوئی دعا اصغر
قدیم یاد کی الہڑ جوانی لگتی ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اُب تک ٹھاٹھیں مارتا ہے
دیکھ کے تجھ کو، لہو مجھ میں

غزلیں

قرار آنے لگا ہے، کچھ قرار آنے لگا ہے
مجھے پھر دل پہ اپنے اختیار آنے لگا ہے

یہ میں کیا دیکھتا ہوں خواب آنکھوں میں نہیں ہیں
ترے جانے کا شائد اعتبار آنے لگا ہے

مرے سینے سے سِل ہٹنے لگی ہے آرزو کی
کسی کے شیشۂ دل پر غبار آنے لگا ہے

سمجھتا ہے کہ مر جاؤں گا میں اس سے بچھڑ کر
مری باتوں میں وہ بے اعتبار آنے لگا ہے

پلانا تھا مجھے یہ جام تو پہلے پلاتا
کہ شب آخر ہوئی ہے اور خمار آنے لگا ہے

انہیں لگتا ہے دھوکہ کھا رہی ہے قوم ساری
مجھے ان کی سبک ذہنی پہ پیار آنے لگا ہے

دیوانے، اب ہجومِ عاشقاں کی لاج رکھنا
تری آواز پہ دیوانہ وار آنے لگا ہے

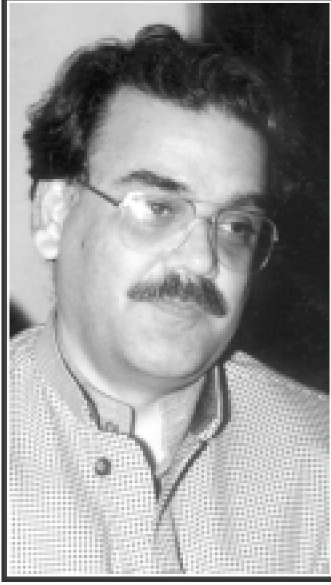

شاہنواز زیدی

فیصلہ دے دے مگر پہلے سماعت بھی تو کر
کیا فقط نام کا عادل ہے، عدالت بھی تو کر

غم کے بھی قائدے، قانون ہوا کرتے ہیں
شوق سے کرنا ستم، پہلے محبت بھی تو کر

تو بھی ہو جائے گا مقبول زمانے بھر میں
سرِ دربار ''نہیں'' کہنے کی ہمت بھی تو کر

چل سکے گا طلبِ راہِ خدا میں کیونکر
حکمِ ناجائز حاکم سے بغاوت بھی تو کر

ایک اللہ کو سجدے کی تو جلدی ہے تجھے
باقی معبودوں سے انکارِ عبادت بھی تو کر

کس لیے خاک نشینوں پہ ستم ڈھاتا ہے
خاک سے آیا ہے تو، خاک کی عزت بھی تو کر

غزل

جتنے بھی نام تری ذات سے منسوب رہے
ایک آزار کی سولی پہ وہ مصلوب رہے

پیار کے نام پہ ہر آن جو معتوب رہے
وہ بہت خوب، بہت خوب، بہت خوب رہے

جس کو محسوس نہ ہوا غالب و مغلوب کا فرق
اُس پہ لازم ہے کہ تا عمر وہ مغضوب رہے

ان کی ترسیل کسی طور بھی ممکن نہ ہوئی
جذبے سب دل میں رہے، ہاتھ میں مکتوب رہے

کوئی موضوع ملاقات میں تشنہ نہ رہا
پھر بھی کچھ لفظ جو مطلوب تھے، مطلوب رہے

اُن کو تو زیست کے ہر باب سے منہا کر دو
دارِ امید پہ وہ لمحے جو مصلوب رہے

آج تو بزم میں اُن کا بھی بہت چرچا ہے
وہ جو اک وقت میں ناچیز سے مرعوب رہے

کتنی امیدیں لگا رکھی تھیں ہم نے اُن سے
اپنی ہی ذات میں گم اپنے وہ مندوب رہے

اُن کی جانب سے بہت خوب صدائیں آئیں
جن کے اشعار ہمیشہ ہمیں مرغوب رہے

خالدہ انور

غزلیں

کیسے نکلوں خُمار سے باہر
بازوؤں کے حِصار سے باہر

درد نکلا ہے صبر کی حد سے
اشک نکلے قطار سے باہر

چند لمحوں کی مختصر قربت
اور یادیں شمار سے باہر

اس لیے اُس کی یاد میں گم ہوں
بھولنا اختیار سے باہر

اور جائیں کہاں مہ و انجم
روز و شب کے مدار سے باہر

کون دستک پہ کھولتا ہے در
کوئی آئے پکار سے باہر

طفلِ دل پھر اُداس بیٹھا ہے
کوئی لے جائے پیار سے باہر

کوئی رخشندہ! ملنے آیا ہے
چل چلیں انتظار سے باہر

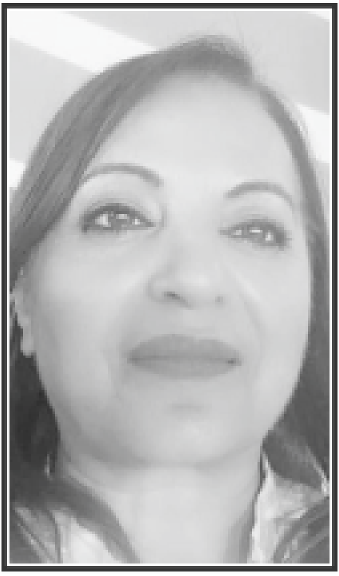

رخشندہ نوید

شاخِ تن آپ کے شانوں میں حمائل ہوگی
ایک لمحے کو ہوا تک بھی نہ حائل ہوگی

دل کے جنگل کی طرف تیر بکف آئیں، حضور!
اور کیا ہوگا کوئی ہرنی ہی گھائل ہوگی

میں کہاں رقص میں، ساکت ہے مرا پورا وجود
جو چھنک اُٹھی ہے، احساس کی پائل ہوگی

اک یہی سوچ کے گھر رکھ لیا تنہائی کو
یونہی در در جو پھرے گی تو یہ زائل ہوگی

میں کہا کرتی تھی رخشندہ ترے بارے میں
تو نہ باتوں سے کسی بات پہ مائل ہوگی

غزل

سرِ دیوار چنوائی گئی ہوں
کبھی ہیروں میں تلوائی گئی ہوں

میں عورت تھی، شریکِ تخت کب تھی؟
سو ملکہ کہہ کے بہلائی گئی ہوں

مرے پیکر کا تھا یہ کب تقاضا!
جو ہر اک گام بہکائی گئی ہوں

مقدس ہیں سبھی رشتے جو میرے
تو کیوں بازار میں لائی گئی ہوں؟

مری ہر سوچ پہ پہرے لگے ہیں
کہاں ذی عقل کہلائی گئی ہوں

بنا کر آئنہ افروز رضوی
ہدف پتھر کا ٹھہرائی گئی ہوں

افروز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہماری سیرتیں تھیں ایک جیسی
کوئی خوش رو، کوئی کم رو نہیں تھا

غزل

عظمتوں کے امین تھے ہم لوگ
رفعتوں پر مکین تھے ہم لوگ

اک جہاں تھا ہمارا گرویدہ
سنبل و یاسمین تھے ہم لوگ

ہم نے ساحل پہ کشتیاں پھونکیں
اس قدر پر یقین تھے ہم لوگ

سب ہماری مثال دیتے تھے
اس قدر بہترین تھے ہم لوگ

آسماں پر نظر ہماری تھی
گرچہ اہل زمین تھے ہم لوگ

اب تو انگارے ہیں زبانوں پر
شہد تھے انگبین تھے ہم لوگ

کائناتیں ہمارے ہاتھ میں تھیں
کیسے حجرہ نشین تھے ہم لوگ

ایک ہیبت تھی کفر کے دل پر
اس قدر آتشین تھے ہم لوگ

ہم سے ہٹتی نہ تھی نظر سب کی
ایسا نقش حسین تھے ہم لوگ

جانے کس کی نظر لگی سرور
رشک صد آفرین تھے ہم لوگ

ہم نے ہر سو محبتیں بانٹیں
سب دلوں میں مکین تھے ہم لوگ

ہم نے انسانیت کی خدمت کی
ہر کسی کے معین تھے ہم لوگ

ہم سے تاریکیاں بھی خائف تھیں
ایسے روشن جبین تھے ہم لوگ

ہم نے دنیا کو علم سکھلایا
کیا ذہین و فطین تھے ہم لوگ

سرور حسین نقشبندی

غزلیں

خواب میں تیر چل گیا آنکھوں سے نیند اڑ گئی
جانے مجھے یہ کیا ہوا آنکھوں سے نیند اڑ گئی

ہائے شکستہ دل مرا کہتا رہا یہ بار بار
کس نے مجھے ڈرا دیا آنکھوں سے نیند اڑ گئی

بیٹھے ہیں کس سکون سے ہاتھوں پہ اپنا دل لیے
جب سے وہ دلربا گیا آنکھوں سے نیند اڑ گئی

ہجر کے ساتھ ساتھ غم اس کو نہ مل سکا تو پھر
دل نے عجب غضب کیا آنکھوں سے نیند اڑ گئی

تیری خموشیوں میں بھی تھا کوئی رازِ گفتگو
تیرا خیال آ گیا آنکھوں سے نیند اڑ گئی

یاد کی شمع جل گئی خامشیوں کے درمیان
اور میں دیکھتا رہا آنکھوں سے نیند اڑ گئی

نور ہی نور تھا ندیم پاؤں سے لے کے تا بہ سر
دیکھ کے حسن آپ کا آنکھوں سے نیند اڑ گئی

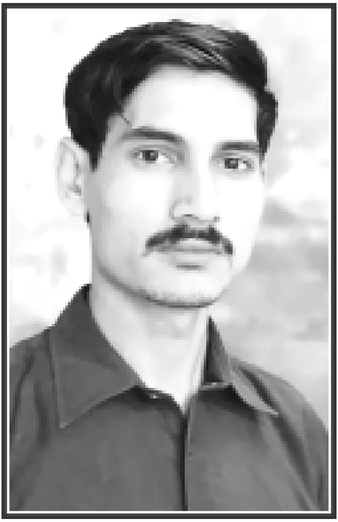

ندیم ملک

رات کا شور تھم گیا صبح کی آنکھ کھل گئی
آنکھوں میں خواب جم گیا صبح کی آنکھ کھل گئی

پھر سے ترے خیال میں جلتا رہا لہو مرا
روح میں کوئی غم گیا صبح کی آنکھ کھل گئی

ایسی کرشمہ سازیاں دیکھی ہیں میں نے رات میں
ہاتھوں سے جب قلم گیا صبح کی آنکھ کھل گئی

اپنے تصورات پر اشک نہیں رواں ہوئے
اشکوں میں تو بہم گیا صبح کی آنکھ کھل گئی

مجھ کو ندیم ہجر نے ایسا شعور دے دیا
وقتِ زوالِ غم گیا صبح کی آنکھ کھل گئی

غزل

خانہ بدوش، نقل مکانی میں ہم بھی تھے
مجبور تھے کہ ہجرتِ ثانی میں ہم بھی تھے

کچھ منظروں کے بیچ میں گم ہو کے رہ گئے
اور حاشیے کے حُسنِ معانی میں ہم بھی تھے

محفوظ کر دیا گیا لوحِ ازل پہ حرف حرف
یہ بھی تو طے ہے عالمِ فانی میں ہم بھی تھے

منہ پھٹ ہیں اپنے عہد کے بچے یہ کیوں کہیں
بے باک و مستعد تو جوانی میں ہم بھی تھے

بستی کے ہر مکان کو گرداب کھا گیا
تم بھی تھے زیرِ آب تو پانی میں ہم بھی تھے

ہم نے لکھا تھا حضرتِ آدم کا رزمیہ
تصویرِ صادقین میں، مانی میں ہم بھی تھے

تنکے کی تھی تلاش سہارے کے واسطے
لہروں کے ساتھ ساتھ روانی میں ہم بھی تھے

کیسے نہ چھوتی عشق میں رفعت کو داستاں
تم بھی تھے اور کمالِ معانی میں ہم بھی تھے

دونوں کو کیا ملا ہے زمانے دوڑ میں
کہنے کو تم بھی ربطِ زمانی میں ہم بھی تھے

ہم کو بھی کچھ اُمید تھی فصلِ بہار کی
بے برگ و بار عہدِ خزانی میں ہم بھی تھے

ہم کو بھی اپنی قدروں کے مٹنے کا غم تو تھا
وہ اِس لیے کہ نسلِ پُرانی میں ہم بھی تھے

وہ بھی ہر ایک گام تھا راہِ عدم کی سمت
سچ ہے یہی کہ لمحۂ فانی میں ہم بھی تھے

تھے ہم گریباں چاک اُڑاتے تھے خاک بھی
مجنوں صفت تو دشتِ جوانی میں ہم بھی تھے

تھوڑا بہت تو اپنا بھی کردار تھا نبیل
کچھ ثانیے تو تیری کہانی میں ہم بھی تھے

نبیل احمد نبیل

غزل

کس کرب سے ہم گزر رہے ہیں
لمحہ لمحہ بکھر رہے ہیں

ممکن تھا علاج سب دکھوں کا
جانے کہاں چارہ گر رہے ہیں

شاید تجھے یاد ہو غمِ زیست
ہم بھی ترے ہمسفر رہے ہیں

دنیا کا وہ حال ہو گیا ہے
جینے سے بھی اب تو ڈر رہے ہیں

دن رات خیال ہے اُنہی کا
وہ ہم سے جو بے خبر رہے ہیں

گھر کا ہمیں چین چاہیے تھا
جس عمر میں در بہ در رہے ہیں

کیسی تھیں جو کاٹ آئے راتیں
کیسے ہیں جو دن گزر رہے ہیں

آج اُس کا نشاں بھی مٹ گیا ہے
جس دشت میں عمر بھر رہے ہیں

ارزاں جو ہوئے تو دھیان آیا
ہم بھی کبھی معتبر رہے ہیں

حیف اُن کی حیات پر رضا جو
دنیا کی طلب میں مر رہے ہیں

علی رضا

غزل

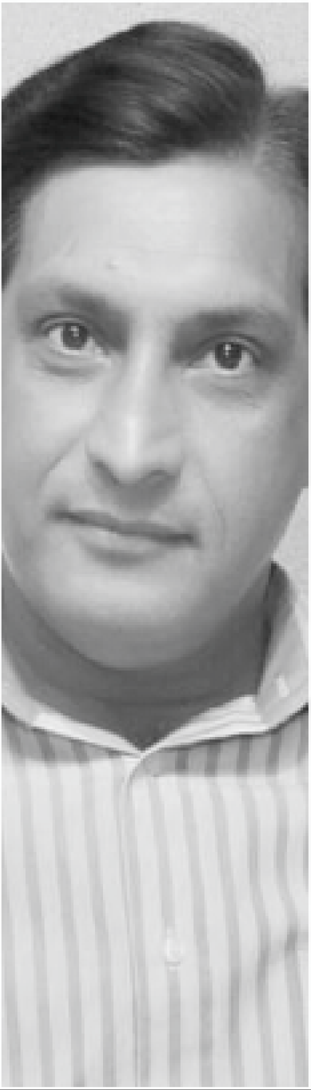

جو دل کے موڑ پہ یکدم اٹک بھی سکتا ہے
وہ راہِ عشق سے اک دن بھٹک بھی سکتا ہے

جسے ہو ناز بہت اپنی بادشاہت پر
وہ زندگی کے سروں پر مٹک بھی سکتا ہے

جسے حیات کی سب تلخیوں نے تنگ کیا
وہ چھت کے پنکھے سے آخر لٹک بھی سکتا ہے

مفاہمت کے اصولوں پہ چلنے والے، سن!
یہ شہر تیرا عقیدہ جھٹک بھی سکتا ہے

مفاد کے لیے وحشت کا بیج بو تو دیا
مگر یہ خار دلوں میں کھٹک بھی سکتا ہے

جو تو نے کھول دیا نفرتوں کا دروازہ
دیارِ ذہن میں شیطاں پھٹک بھی سکتا ہے

جو آفتاب کے رخ سے نظر ہٹا نہ سکا
وہ اس کی دھوپ میں زلفیں جھٹک بھی سکتا ہے

آفتاب خان

غزلیں

دل اُمنگوں سے بھرا ہے
تیری چاہت کا آسرا ہے
چار جانب ہیں کہکشائیں
کس جہاں کی یہ یاترا ہے
غرض کسی کو نہیں کسی سے
کوئی کھوٹا ہے یا کھرا ہے
دل سے پھوٹے ہزار چشمے
یہ محبت کی نیاگرا ہے
نیند کھڑکی سے آ گئی ہے
خواب تکیے پہ دھرا ہے

راستے پھولوں بھرے ہیں
اور موسم بھی ہرا ہے
یاں سے نکلے گا ایک سورج
یہ اُمیدوں کا سامرہ ہے
آپ جو چاہیں کریں جی
آپ کی خواہش بجا ہے

شبہ طراز

دف بجاتے، ہنستے گاتے، گھر سے نکلے ہیں
اچھے دن میں زندانوں کے ڈر سے نکلے ہیں

ایک دفعہ میں ہمت کر کے باہر آئی ہوں
کتنے سارے ڈر میرے اندر سے نکلے ہیں

آئی ہے گھنگھور گھٹا، اب کھُل کے برسے گی
پیاس سے چھلنی نین ہمارے تر سے نکلے ہیں

جیون بھر جس خوف نے پنجے گاڑے رکھے تھے
خوف یکایک اپنے جیون بھر سے نکلے ہیں

شہرِ علم سے بٹنے والی خیراتوں کی خیر
علم کے سارے تاجران کے در سے نکلے ہیں

بچپن میں سوچا تھا بدلیں گے ہم ایک زمانہ
سارے وہ خنّاس ہمارے سر سے نکلے ہیں

آسمان تو اب بھی سارا ہم پر کھلتا ہے
امیدوں کے پنچھی سب بے پر سے نکلے ہیں

غزلیں

شبیر نازش

کشتیٔ چشمِ رواں کا ناخدا کوئی نہیں
حکمراں تو سب ہیں لیکن رہنما کوئی نہیں

ظلم کی چکی میں پستے یہ مرے سادہ عوام
ان سہاروں پر ہیں جن کا آسرا کوئی نہیں

کس میں ہمت ہے جو اٹھے اور کھولے سب کے راز
واقفانِ حال سب ہیں، بولتا کوئی نہیں

دیکھیے کس میں عزیزو! عیب اپنی ذات کے
سب کے سب ہیں بت یہاں، پر آئنہ کوئی نہیں

اس شجر کی زندگی بھی یارِ من کیا زندگی
جس شجر پر پنچھیوں کا گھونسلا کوئی نہیں

گردشِ دوراں! اک ایسا پل کہ اس سے کہہ سکوں
جز خدا تجھ بن مرے دل میں رہا کوئی نہیں

ایک ہی مکھڑا سبھی گاتے ہیں نازش! عمر بھر
عشق ہے وہ گیت جس کا انترا کوئی نہیں

ناخوب نہیں کچھ بھی یہاں خوب سے باہر
درکار مگر کچھ نہیں مطلوب سے باہر

وہ رنج کہ جس رنج کا ہے رنج ابھی تک
وہ رنج ابھی ہے دلِ معتوب سے باہر

اک بات ابھی تک نہیں تحریر میں آئی
اک بات ابھی ہے مرے مکتوب سے باہر

اک ذات میں ہر ذات ہے، ہر ذات میں اک ذات
لا ہو کہ ہو الاّ، نہیں محبوب سے باہر

تم خود یہاں ہوتے تو کوئی راہ نکلتی
اب صورتِ حالات ہے مندوب سے باہر

کب ہونٹ ہوئے صبر کے آلودۂ شکوہ
کب ضبط ہوا دیدۂ یعقوب سے باہر

جب دل ہو مگن یار کی تسبیح میں نازش
دھڑکن کبھی ہوتی نہیں اسلوب سے باہر

غزل

سوچ میں کیا ہے اور گمان میں کیا
تیرے میرے درمیان میں کیا

ساری مخلوق ہے اماں میں تری
ایک بس میں نہیں امان میں کیا

چھپ کے بیٹھے ہو کیوں اندھیرے میں
اک دیا بھی نہیں مکان میں کیا

سن کے چہرے کی اُڑ گئی رنگت
کہہ دیا اس نے میرے کان میں کیا

جو زمیں پر نظر نہ آئے کہیں
اس کو ڈھونڈوں میں آسمان میں کیا

موت آسان جینا ہے دشوار
ہو رہا ہے ترے جہان میں کیا

بھیج کر تو نے مجھ کو دنیا میں
مجھ کو ڈالا ہے امتحان میں کیا

ہر ستائش تجھی کو زیبا ہے
لکھے اشفاق تیری شان میں کیا

محمد اشفاق بیگ

غزلیں

بہار رت میں حزیں ہے برائے امن یہاں
ہمارا کوئی یہیں ہے برائے امن یہاں

سمجھ لیا جسے مشکوک اس زمانے نے
وہی تو خاک نشیں ہے برائے امن یہاں

نکل تو آئی کسی سلسلے سے امن کی راہ
مگر جو اس پہ یقیں ہے برائے امن یہاں

سفید پھول مرے کام آگیا ورنہ
کوئی درخت نہیں ہے برائے امن یہاں

یہ قتلِ عام ہُوا اور کسی بہانے سے
وگرنہ تو مرا دیں ہے برائے امن یہاں

کوئی بھی غم نہیں ہنگامِ صبح و شام کا یوں
جب ایک پردہ نشیں ہے برائے امن یہاں

کوئی تو سینے پہ تمغے سجا کے پھرتا ہے
کوئی تو زیرِ زمیں ہے برائے امن یہاں

اسی کے دم سے حکومت ملی ہے اوروں کو
قمر جو گوشہ نشیں ہے برائے امن یہاں

قمر نیاز

چاند چہرے اگر نڈھال کریں
کیوں نہ دل والے پھر ملال کریں

قتل میرا اگر ضروری ہے
کیا برا ہے جو ہم خیال کریں

وہ زمیں ہو غزل کی یا دل کی
نام اپنے ہی انتقال کریں

کیا خوشی ہے جو اب میسر ہے
ایک غم ہے جو ماہ و سال کریں

نہیں ممکن مداوا زخموں کا
تیرے لب کچھ تو اندمال کریں

تیری خدمت کو زندہ ہیں خدام
کچھ تو اپنی بھی دیکھ بھال کریں

دستیابی کا مول کچھ ہو قمر
پھول ایسے نہ پائمال کریں

غزل

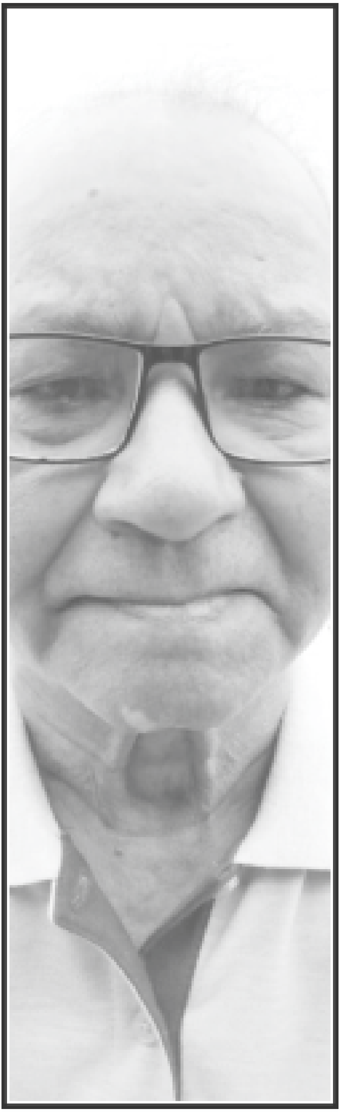

گر ہو معشوق یہ دنیا ساری
عشق کہلائے کہ دنیا داری

بات کا زخم تو گہرا ہوتا
یعنی تلوار ہے یہ دو دھاری

عشق آزار ہے، سو لائے ساتھ
یہ اکیلی نہیں ہے بیماری

عزم گر ساتھ ہمارے ہی رہے
ہم اکیلے ہیں سبھی پر بھاری

مدتوں زخم ہی رستا رہتا
چوٹ گر دل پہ ہو کھائی کاری

مسکرائیں کہاں تک ہم اعجاز
اب نہیں ہوتی ہے یہ فنکاری

اجمل اعجاز

غزل

پھول کی جب بھی مہک آتی ہے
یاد کیوں تیری لہک آتی ہے

سوچ جو کہتی وہ کرتی آنکھیں
چھت سے پانی کی ٹپک آتی ہے

وہ تو پہلو میں بٹھانا چاہے
سامنے سب کے جھجک آتی ہے

اٹھتے معصوم جنازے دیکھوں
دیکھتے آنکھ چھلک آتی ہے

پوچھتا ہے وہ چبھو کر نشتر
ٹیس آتی ہے کسک آتی ہے

عدل ہونا ہے یہاں ہو کہ وہاں
ہم کو آوازِ ملک آتی ہے

جو یتیم اور یہاں مظلوم اک
اس کو امدادِ فلک آتی ہے

آسماں گریۂ عاشق پہ ہنسا
کس طرح کیسے دھنک آتی ہے

تم نہیں یاد تمھاری اکثر
مجھ کو ملنے بے دھڑک آتی ہے

کوئی پوچھے جو جدائی کا سبب
کیوں امام آنکھ چھلک آتی ہے

مظہر امام

غزل

ترے طرزِ تکلم کی لطافت کھینچ لائی ہے
میں خود آیا نہیں مجھ کو طبیعت کھینچ لائی ہے

ابھی تو کنجِ تنہائی میں آیا تھا سکوں دل کو
امیدِ وصل پھر دل میں اذیت کھینچ لائی ہے

ترا ترکِ تعلق یاد تھا مجھ کو مگر پھر بھی
تری موجِ تبسم کی شرارت کھینچ لائی ہے

بہت مشکل تھا پندارِ وفا کا ٹوٹ کر جڑنا
مگر شہرِ محبت کی روایت کھینچ لائی ہے

ابھی نکلی نہیں تھی زندگی شہرِ حوادث سے
ہمیں واپس پھر اپنے دل کی وحشت کھینچ لائی ہے

ذرا سی بے خودی نے کر دیا محروم جنت سے
مگر واپس مجھے اپنی ندامت کھینچ لائی ہے

مجھے معلوم ہے کتنا تجھے پاسِ تمنا ہے
مگر پھر بھی مجھے اپنی شرافت کھینچ لائی ہے

ارادہ تو نہیں تھا لوٹ کر بستی میں آنے کا
کسی گزرے زمانے کی کرامت کھینچ لائی ہے

زمیں کا کینوس محدود جب پڑنے لگا فرحان
ستاروں کی طرف پھر فکرِ وسعت کھینچ لائی ہے

سرور فرحان

غزلیں

وسیم جبران

لشکر آیا بادل کا
جادو تیرے کاجل کا

جانے کب یہ دل بگڑے
کیا ہے بھروسا پاگل کا

ترسے قطرے قطرے کو
منہ بھی کھلا تھا چھاگل کا

سانسیں ایسے آتی ہیں
جیسے مرنا پل پل کا

باندھا اُس نے جاتے وقت
ایک کنارہ آنچل کا

ماں کی دعا ہے زادِ سفر
اور سفر ہے جنگل کا

کیسے طے ہو گا جبران
رستہ سارا دلدل کا

ریزہ ریزہ بکھرا ہوں
میں اک ٹوٹا سپنا ہوں
جان بھی تیرے ساتھ گئی
جانے کیسے زندہ ہوں
خون آنکھوں سے بہتا ہے
دل اشکوں سے بھرتا ہوں
بادل جیسا بے گھر ہوں
قریہ قریہ پھرتا ہوں
لہر مٹاتی رہتی ہے
ریت پہ لکھتا رہتا ہوں
مجھ کو کیسے روکو گے
میں اک بہتا دریا ہوں
وہ بھی تو چپ رہتا ہے
میں بھی دل میں رکھتا ہوں
سوکھا پتہ ہوں جبران
تیز ہوا سے ڈرتا ہوں

غزل

اپنی مٹی سے محبت کو نبھانے والے
گو جہنم ہو، نہیں چھوڑ کے جانے والے

سانحہ یہ ہے کہ تعبیر بھی لے بھاگے ہیں
میری مٹھی سے مرے خواب چرانے والے

کاٹ کھانے کو اُمڈتے ہیں در و بام میاں
مر مرا جاتے ہیں جب ناز اٹھانے والے

لوٹ آئیں گے ذرا وقت بدل لینے دو
میری مشکل میں مجھے چھوڑ کے جانے والے

ہم ترے ہجر میں مشکل سے رہے ہیں زندہ
جانے کیا تجھ کو بتاتے ہیں بتانے والے؟

قصہ گو آج کہانی میں کہاں ہیں وہ لوگ
اپنے گھر بار محبت میں لٹانے والے

خواب تو خواب ہیں اب ان سے بھلا کیا شکوہ
ہاں مگر دن میں ہمیں خواب دکھانے والے

وصل کی راہ نکالیں گے وہی آبلہ پا
دے کے جاں ہجر کی دیوار گرانے والے

مشعلیں لے کے اندھیرے میں چلے آتے ہیں
نام پر روشنی کے آگ لگانے والے

ڈھونڈتی پھرتی ہے اب رات، مگر اب وہ کہاں
ہاں وہی شعر، وہی گیت سنانے والے

ماتمی بن کے وہ آئے ہیں مری میت پر
ساتھ ہو کر مرے مقتل میں نہ آنے والے

مجھ سے امیدِ شفاعت بھی لگائے ہوئے ہیں
زندگی بھر مرے اوصاف چھپانے والے

ایک دن خود بھی اسی پھیر میں آئیں گے ضرور
ظلم کو عدل کی مسند پہ بٹھانے والے

علمدار حسین

غزل

راجہ عبدالقیوم

اب کسی اور کے در پر نہیں جانا چاہے
دل یہاں رہنے کا کچھ اور بہانہ چاہے

اس نے اس دل سے نہ جانے کی قسم کھائی ہے
اور آئے بھی کوئی کیسے جو آنا چاہے

میری بربادی میں اک حصہ میری سوچ کا ہے
میں اسے چاہوں جسے سارا زمانہ چاہے

کیا بچے گا؟ میں اسے لاکھ بچانا چاہوں
وہ حسیں تیرِ نظر دل کا نشانہ چاہے

اسد اللہ خاں غالب ہے وہ غالب ہی رہے گا
اس سے کیا ہوتا ہے جو یاس یگانہ چاہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم تجھ سے نئی دوری کا غم پائیں گے ہم
حادثوں کی سیڑھیاں چڑھتے چلے جائیں گے ہم

غزل

پہلے تو سب جہاں سے جدا کر دیا مجھے
پھر اپنے آپ سے بھی خفا کر دیا مجھے

جاتا نہیں تھا بچپنا میرے مزاج سے
اک حادثے نے کتنا بڑا کر دیا مجھے

جب راس بود و باش اسیری کی آ گئی
کچھ سوچ کر کسی نے رہا کر دیا مجھے

خواب و خیال ہونے لگی ہے شگفتگی
اک ایسی سوگوار فضا کر دیا مجھے

کس مصلحت میں کہتا رہا پہلے فرضِ عین
حجت بغیر جس نے قضا کر دیا مجھے

جینے کی آرزو بڑھی مرنا بھلا لگا
امرت میں ایسے زہر ملا کر دیا مجھے

اک عمر اجنبی سا رہا اپنے واسطے
اب مجھ کو جیسے اس نے کما کر دیا مجھے

کتنے ہی ماہ و سال کی پرتیں اتار دیں
جاذب کسی نظر نے نیا کر دیا مجھے

اکرم جاذب

غزل

چاندی کو لوٹتے ہیں نہ سونا چراتے ہیں
کچھ چور ہیں جو صرف کھلونا چراتے ہیں

شہرِ عمل میں چھوٹ ہو سرقے کی تب بھی ہم
کردار کا نحیف سا بونا چراتے ہیں

آدھا حرام ہے یا کہ پورا حرام یہ
روٹی خریدتے ہیں، صلونا چراتے ہیں

پورے کا شک صحیح نہیں سالکان کا
ہم تو سوا چراتے ہیں، پونا چراتے ہیں

خطرہ نہیں ہے نام کا اس واردات میں
چل ساتھ ایک آنکھ سے رونا چراتے ہیں

دامن سے گر رہی ہیں جو دھاگوں کی ڈوریاں
لگتا ہے آپ سینا پرونا چراتے ہیں

آوارگی ہی طنز کرے مجھ بے خواب پر
کیا رتجگے ابھی بھی، بچھونا چراتے ہیں

ہم سے وبا کے بعد بھی ان کا گلے نہ جی
جی، آج بھی وہ نام کرونا چراتے ہیں

ساگر مرے کلام کے ان سارقوں سے کہہ
مصرعے نہیں یہ ذات کا ہونا چراتے ہیں

ساگر حضور پوری

غزل

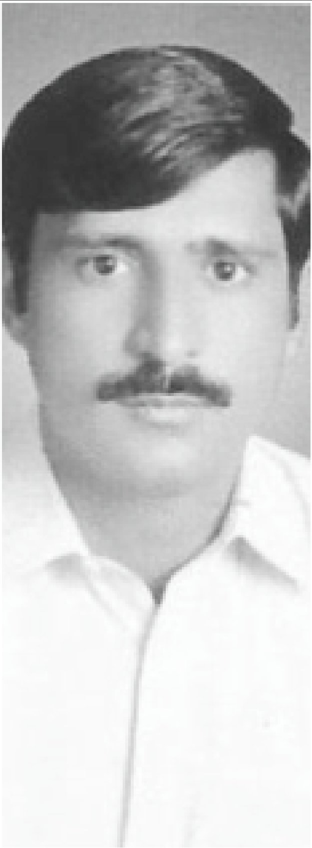

اعجاز دانش

میں تیرے ساتھ چلنا چاہتا ہوں
مقدر کو بدلنا چاہتا ہوں

جو تیرے دل کے آنگن میں لگی ہے
اسی آتش میں جلنا چاہتا ہوں

جو رستہ منزلوں سے دور کر دے
میں وہ رستہ بدلنا چاہتا ہوں

جو میری فکر کو یکسر بدل دے
میں اس سانچے میں ڈھلنا چاہتا ہوں

میں اپنی ذات میں گم ہو گیا تھا
وہاں سے اب نکلنا چاہتا ہوں

سنبھلتا ہوں کبھی گرتا ہوں دانش
کبھی گر کر سنبھلنا چاہتا ہوں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد نمازِ مدح ادا ہو تو کس طرح
کس نم مہک سے تیرے ثنا گر وضو کریں

غزل

کمزور نہ تھا زور دکھانا پڑا اپنا
لشکر مجھے میدان میں لانا پڑا اپنا

دشمن تھے مقابل مرے، غدار تھے پیچھے
حکمت سے مجھے شہر بچانا پڑا اپنا

اک جان تھی اس جسم میں سو جان لڑا کر
دھرتی سے جڑا رشتہ نبھانا پڑا اپنا

ممکن ہی نہیں تھا مرے معیار تک آنا
سر آخرِ کار اُس کو جھکانا پڑا اپنا

پھر یوں بھی ہوا ذہن بدلنے لگے رستا
جیسے کہ کسی کھیت میں دانہ پڑا اپنا

ممکن جو نہیں تھا اسے ممکن کیا آخر
کاندھوں پہ ہر اک بوجھ اٹھانا پڑا اپنا

کچھ جاگتے جیتے ہوئے انساں ہیں یہاں بھی
اک دن اسے احساس دلانا پڑا اپنا

محمد اشرف کمال

غزل

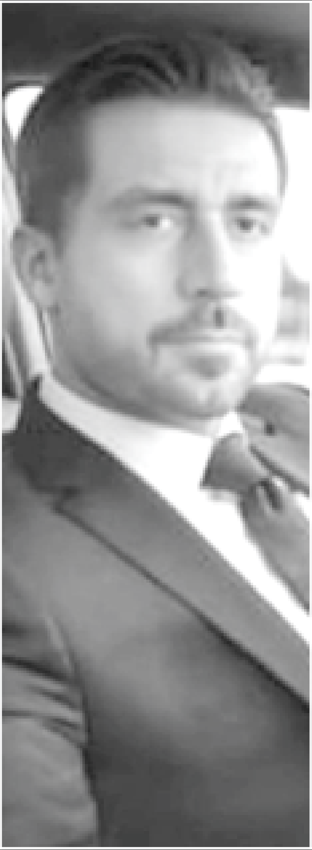

کبھی گرتے ہیں کبھی گر کے سنبھل جاتے ہیں
جو وہ لکھ دے اسی کردار میں ڈھل جاتے ہیں

گھر کے رستے سے بھی ہو جاتی ہے وحشت اکثر
کبھی انجان سے رستوں پہ نکل جاتے ہیں

جسم اور روح کے مابین پرانے رشتے
کیسے ہوتا ہے کہ پل بھر میں بدل جاتے ہیں

تھرتھراتی ہوئی بجھ جاتی ہے لو شعلے کی
رقص کرتے ہوئے پروانے بھی جل جاتے ہیں

ماں کی آغوش میں وہ ناز سے رونے والے
اب یہ عالم ہے اشاروں سے بہل جاتے ہیں

اتنا بے باک تکلم بھی نہیں ٹھیک حبیب
عشق کرتے ہیں تو بچے بھی سنبھل جاتے ہیں

بشیر احمد حبیب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ میں نہیں، مرا پرتو نہیں، یہ میں تو نہیں
گماں سا کیوں مجھے گزرا؟ کہیں یہ میں تو نہیں

غزل

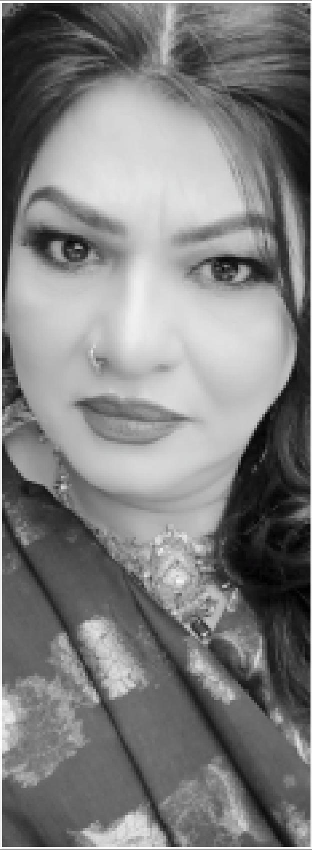

جیا قریشی

خزاں کے رنگ میں فصلِ بہار میں گزری
جیا یہ عید فقط انتظار میں گزری

حیات قید تھی لیکن کبھی نہ بوجھ بنی
کچھ ایسے پیار کے رنگیں حصار میں گزری

یقین اپنا سلامت تھا لفظ و معنی پر
وہی تھی زندگی جو اعتبار میں گزری

کبھی کبھی جو پلٹ کر میں دیکھ لیتی ہوں
گمان ہوتا ہے اک خار زار میں گزری

مہک سی آتی رہی اجنبی مسافر کی
بعید ہو کے بھی قرب و جوار میں گزری

پتنگ تھی جو ہوائیں اڑائے پھرتی تھیں
کہاں یہ زیست مرے اختیار میں گزری

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

درد کی سُنسنی نہ تھی، رُوح کے برف زار میں
آگ ابھی لگی نہ تھی، رنگ بھرے چنار میں

غزلیں

زمانے سے وہ اتنا ڈر گیا ہے
کسی سے بن کہے کچھ مر گیا ہے

نجانے کیا چھپا تھا دل میں اسکے
عجب اک درد سا دے کر گیا ہے

تمہیں تو اپنی ضد کو تھا نبھانا
مرے ہاتھوں سے میرا گھر گیا ہے

رضا تیری بھی تھی اس فیصلے میں
مگر الزام میرے سر گیا ہے

وہ گہرے پانیوں سے ڈرنے والا
سمندر پار کیسے کر گیا ہے

نہ سمجھو گر تو کب یہ سانحہ ہے
کسی کا خواب تھا جو مر گیا ہے

نائلہ راٹھور

پھر لہو سا جگر، میں نے دیکھا نہیں
جب گیا چھوڑ کر، میں نے دیکھا نہیں

اپنے زخموں کو میں دیکھتی رہ گئی
مر گیا جو ادھر، میں نے دیکھا نہیں

چھوڑ کر میداں دشمن کو جانا پڑا
تجھ سا سینہ سپر، میں نے دیکھا نہیں

شام تک تو وہ میری، نظر میں رہا
کب گیا اپنے گھر، میں نے دیکھا نہیں

چھپ گئے سارے منظر مری آنکھ سے
ہو گئی، کب سحر، میں نے دیکھا نہیں

میں نے خونِ جگر سے جو سینچا چمن
کب گیا وہ بکھر، میں نے دیکھا نہیں

خواب جو میں نے، دیکھا تھا، کوکی! سدا
ویسا کوئی تو پھر، میں نے دیکھا نہیں

کوکی گل

غزل

کون جانے کس طرف کو وقت کی پرکار تھی
مہر کی گردش میں شاید ذات کی تکرار تھی

نکتہ نکتہ ایک دنیا، قطرہ قطرہ اک جہاں
خلقتِ ہستی کی ہر دیوار پر اسرار تھی

روشنی میں تھا کوئی نادیدہ نقشِ لامکاں
اور ہر ذرے کی آنکھوں میں نمو دیدار تھی

خود کو جب آئینۂ امکان میں دیکھا گیا
آنکھ بھی حیرت بنی، اور بات بھی انکار تھی

کون سے لمحے میں ہم سے چھن گئی وہ اصل ذات
پھر جو پایا، ایک خاموشی پسِ اقرار تھی

وقت کے ہر موڑ پر ہم ٹوٹتے بنتے گئے
ہر شکستہ زاویے میں خواہشِ پرکار تھی

موت بھی آغاز کا دروازہ بن کر کھل گئی
کائنات ثانیہ کی سمت یہ رفتار تھی

کب نبی اور فلسفی ہیں عارف و سالک فقط
اک مسافر تھا، مگر ہر نقش میں تلوار تھی

اپنی ہی پرچھائیوں میں کھو گیا آخر ولی
جستجو جس کی تھی وہ ہی باعثِ اسرار تھی

شاہ روم خان ولی

غزل

اک سوزِ اندروں ہمیں جب عشق میں ملا
تب ہم کو زندگی کا سبب عشق میں ملا

آنسو ملے کبھی تو کبھی مسکراہٹیں
وجہ غم و جواز طرب عشق میں ملا

کچھ چاہتوں کی نرم روی ہو گئی بہم
کچھ حاسدوں کا غیض وغضب عشق میں ملا

بس ایک آدھ پل ہی گزارا تمہارے ساتھ
ورنہ ہمیں سکون ہی کب عشق میں ملا؟

بے خوابی اضطراب کسک اور فشار خوں
نعمان جو طلب نہ تھی سب عشق میں ملا

نعمان محمود

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ترے حرف میں ضیا ہے، ترا فن جہت نما ہے
رخِ یار جلوہ آرا پسِ ماہ و سال ہونا

غزل

کیا بتائیں ہم کدھر مصروف ہیں
سوچ میں شام و سحر مصروف ہیں

منتظر ہیں قافلے کی گھنٹیاں
گفتگو میں ہم سفر مصروف ہیں

سانس لینے کی بھی فرصت ہے کہاں
کام میں ہم اس قدر مصروف ہیں

ہرطرف اک تیرگی کا راج ہے
یہ کہاں شمس و قمر مصروف ہیں

رابطے کی بھی کوئی صورت تو ہو
آپ میری جاں کدھر مصروف ہیں

سب پرندے لوٹ کر آئے نہیں
سو دعاؤں میں شجر مصروف ہیں

ڈھو رہے ہیں رات دن غم ہجر کا
اس لیے آٹھوں پہر مصروف ہیں

کھو گئی ہے ساتھ جینے کی قسم
وہ اُدھر تو ہم اِدھر مصروف ہیں

آگ بھڑکی ہے جو آصف اس قدر
راکھ میں بھی کچھ شرر مصروف ہیں

یاسر رضا آصف

غزل

مست لوگ ہیں ہم تو اپنے حال میں خوش ہیں
وجد میں ہی رہتے ہیں اور دھمال میں خوش ہیں

اب ہمیں یہ آزادی بھی نہ راس آئے گی
ہم ہیں وہ پرندے جو تیرے جال میں خوش ہیں

ایک خواب کی صورت، ان اداس راتوں میں
ہم تو تیری یادوں کی سرخ شال میں خوش ہیں

وہ بھلے یہاں رکھے وہ بھلے وہاں رکھے
لاکھ شکر ہے اس کی دیکھ بھال میں خوش ہیں

عشق نے چڑھایا ہے غم کی سولی پر امجد
ہجر میں ترے خوش ہیں ہم وصال میں خوش ہیں

امجد خان تجوانہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عجز تک ہم کو تری شان کے شایاں نہ ملا!
اتنے کم مایہ فقط تیرے ثنا خواں کیوں ہیں؟

غزلیں

ہاتھ تھامے ہوئے، سینے سے لگے، بات ہوئے
مدتیں بیت گئیں ان سے ملاقات ہوئے

لوگ فائز ہوئے توقیرِ شہادت پا کر
اور ہم کشتۂ بدبختیٔ حالات ہوئے

ہر رکاوٹ پہ انہیں راستہ دیتے گئے لوگ
ہم کو روکا گیا شک گزرے سوالات ہوئے

کچھ نگاہوں پہ پڑی رہ گئی ظاہر کی نقاب
اور کچھ آنکھوں سے سب دور حجابات ہوئے

دین کامل کیا اب دین کو طاقت بھی تو دے
کتنی صدیاں ہوئیں پہلی سی عنایات ہوئے

اس دفعہ پھر سے ارسطو وہی ٹھہرے سیّد
جن سے وابستہ شیاطین کے مفادات ہوئے

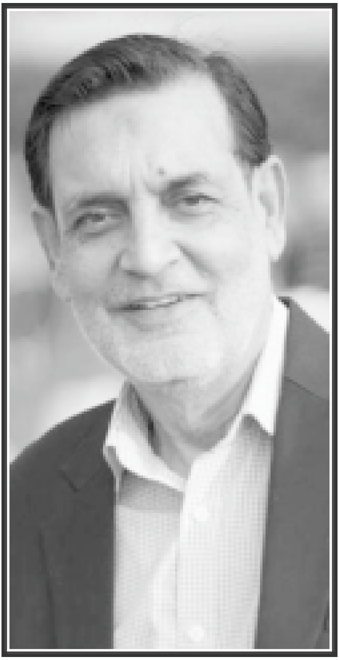

حسن پرویز سیّد

دل خیال کی طاقت سے بے آس نہیں ہوتا
تو دور نہیں ہوتا گر پاس نہیں ہوتا

جب تک کوئی بربادی خود تک نہیں آجاتی
کس کرب میں ہیں دنیا احساس نہیں ہوتا

اس بت کے بنے سنورے پیکر پہ نہیں جاؤ
ہر ترشا ہوا شیشہ الماس نہیں ہوتا

لازم ہے اطاعت کا انکار ہو ظالم سے
حل اس کا میرے پیارے بن باس نہیں ہوتا

سیّد تیرا فرمانا بیکار ہے ضائع ہے
جب تک یہ کہیں نقشِ قرطاس نہیں ہوتا

غزل

لوگ کہتے ہیں ، اک مصیبت ہے
میرے نزدیک عشق نعمت ہے

کون جانے ؟ کہ آپ کو مجھ سے
کوئی مطلب ہے یا محبّت ہے ! ؟

اس کی چوکھٹ پہ بیٹھے ہی رہنا
ہیے عاشق کی ہی سعادت ہے

کرنا خدمت ، شکستہ حالوں کی
میرا ایماں ، مری عبادت ہے

سچ ہے کتنا تو جھوٹ ہے کتنا؟
اس کی توضیح، تیری لکنت ہے!

پردہ داری کی بات کرتے ہو
پردہ داری تو میری عادت ہے

چاہ رہتی ہے، مرنے کی اس میں
کیسی جینے میں یہ سہولت ہے!؟

عمر عظیم چشتی

غزل

علاقہ رہتا ہے تجسیمِ بحر و بر سے مجھے
ذرا شغف نہیں دنیا کے شور و شر سے مجھے

نکل رہا ہوں کسی دشتِ بے کنار کی سمت
کوئی بھی روکنے والا نہیں سفر سے مجھے

مجھے سکون کے لمحے اداس کرتے تھے
ملا دیا ہے اذیت نے کس بھنور سے مجھے

میں رائیگانی کے عالم میں مست ہوں جامی
گرا رہا ہے مسلسل کوئی نظر سے مجھے

مستحسن جامی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم خاک بہ سر، حشر بہ پا رہتے ہیں
ہم کہ چپ رہ کے بھی سرگرمِ نوا رہتے ہیں

غزل

مصر میں جا کر مجھے تہمت کا اندازہ ہوا
یوسفِ ثانی بنا قیمت کا اندازہ ہوا

رات کی رانی اگائی اس نے میری قبر پر
شکر ہے اس کو مری فطرت کا اندازہ ہوا

روشنی میں تیرے خدوخال کے جلوے ملے
آئنے کے سامنے قامت کا اندازہ ہوا

میرا دشمن معترض تھا خستہ حالی پر مری
جب ملا گور و کفن عظمت کا اندازہ ہوا

میں بھی چھت پر چڑھ گیا ہوں سبز بیلوں کی طرح
آج مجھ کو جس کی شدت کا اندازہ ہوا

چھیڑتا رہتا ہوں میں سرشار دل کے زخم کو
اس کی فرقت میں مجھے لذت کا اندازہ ہوا

اکرام الحق سرشار

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

بول بھی اُٹھ اب تو مجھ میں
جاگ اے شعرِ نمو مجھ میں

غزل

امجد مرید حیدری

یہ بُوالہوس ہیں جو عُریاں بدن بناتے ہیں
صنم تراش فقط پیرہن بناتے ہیں

نئی غزل کو سجاتے ہیں جو کلیشے سے
جہانِ تازہ بہ طرزِ کُہن بناتے ہیں

نِگارشات فروشی رگوں میں شامل ہے
یہ لفظ بیچتے ہیں اور دُھن بناتے ہیں

سُنی ہیں آپ نے جو بھانت کی باتیں
یہ حاسدین دریدہ دَہن بناتے ہیں

ہیں اِس طرح کے قُنوطی چہار سُو امجد
جو چاند بعد میں پہلے گہن بناتے ہیں

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

نہ مضطرب ہو، غمِ جاں گزیں! یہ میں تو نہیں
لہو ہیں، سنگ و سرو آستیں، یہ میں تو نہیں

غزل

نظر میں خواب نہیں دل بھی بے قرار نہیں
سو طے ہوا کہ مجھے تیرا انتظار نہیں

جبیں کا داغ عبادت کا اشتہار نہیں
اسی لیے تو یہ پیشانی داغدار نہیں

میں اپنے آپ میں کتنا ہی شرمسار ہوا
کہ تیرے ہونے سے بھی باغ میں بہار نہیں

شمار ٹوٹے ہوئے خواب ہو گئے لیکن
مرے وہ اشک کہ جن کا کوئی شمار نہیں

نہ جانے کون سا درجہ ہے یہ محبت کا
کہ دیکھ سکتا ہوں چھونے کا اختیار نہیں

تم اپنے راز کی باتیں نہ اُس سے کہہ دینا
وہ اچھا شخص ہے پر اچھا راز دار نہیں

جو تُو یہاں تھا تو رونق تمام شہر میں تھی
جو تُو نہیں تو یہاں کوئی کاروبار نہیں

ذرا ٹھہر جا کہ آب و ہوا بدل جائے
ہوائے شہر کئی دن سے خوشگوار نہیں

مرا جنوں بھی تو اب وہ نہیں رہا تیمور
تری نظر میں بھی پہلے سا اب خمار نہیں

سید تیمور کاظمی

غزل

آواز کو غبار نہیں کر رہا ہوں میں
ماحول داغدار نہیں کر رہا ہوں میں

مجھ کو فقط شجر کی نمو سے ہے واسطہ
صحرا کو سایہ دار نہیں کر رہا ہوں میں

دل پر پہن لیا ہے وہ گجرے کے جیسا شخص
لیکن گلے کا ہار نہیں کر رہا ہوں میں

محوِ سفر ہوں خطۂ دنیا کے اس طرف
اور خود کو ہوشیار نہیں کر رہا ہوں میں

رنگوں سے اس کا حسن بڑھاتا ہوں اور بس
دیوار اشتہار نہیں کر رہا ہوں میں

یہ وقت کیفیات سے بھرتا نہیں کبھی
یہ جام اختیار نہیں کر رہا ہوں میں

دریا سے تو معاہدہ طے پا گیا مگر
کشتی کا اعتبار نہیں کر رہا ہوں میں

یہ چل چلاؤ میں نے دیا ہے اسے منیر
دنیا پہ انحصار نہیں کر رہا ہوں میں

منیر جعفری

غزلیں

آپ کے ہوتے پریشان نہیں ہو سکتا
میں کسی طور پشیمان نہیں ہو سکتا

مجھ کو احساس محبت کا دلانے والے
کیا مرے درد کا درمان نہیں ہو سکتا

کیا مجھے چھوڑ نہیں سکتے زمانے والے
کیا مری ذات پہ احسان نہیں ہو سکتا

عمر بھر تو نے اگر ساتھ مرا دے بھی دیا
کسی صورت ترا نقصان نہیں ہو سکتا

جس میں پہچان نہ ہو اپنے پرائے کی اویس
شہر دل اتنا بھی گنجان نہیں ہو سکتا

اویس اکبر

یوں نہ ان کے الم ہمارے ہیں
میرے دل کو بہت وہ پیارے ہیں

کیسے انکو اُتار پاؤں گا
اتنے احسان ہی تمہارے ہیں

کس کے اوپر یقین میں لاؤں
مطلبی میرے دوست سارے ہیں

کوئی مجھ سے خفا ہوا جب سے
تب سے گردش میں اپنے تارے ہیں

آشیاں پر نہ یوں ہی برق گری
باغباں نے کئے اشارے ہیں

ساری دنیا کو جو ثمر پالے
صرف ہم اس کے ہی سہارے ہیں

سمیع احمد ثمر

غزل

تاروں کی جھمکتی باڑھ تلے آنکھوں میں رات گزاری ہے
اور آٹھ منٹ کی دوری پر سورج کی زرد خماری ہے

گردوں پہ کمندیں ڈال چکے، خورشید اچھالا نیزے پر
امکان کی سرحد پار ہوئی، اب آگے کی تیاری ہے

طبلے کی گت لہراتی ہے، کافوری شمعوں کی لو پر
اور نیم شب کے محضر میں سنگت کو اک درباری ہے

مستقبل کے سیارے پر کچھ صاحب امر مشیں زادے
مصروف ہیں کارِ دنیا میں اور اپنے لیے بے کاری ہے

بازار چڑھا تو سوداگر، خوابوں کے بقچے باندھ چلے
رستے میں مگر شب خون پڑا شمشیرِ اجل نے ماری ہے

جس کارن دیس بدیس لڑے لشکر پیادے سالار جواں
قصباتی قحبہ خانے کی چنچل سی بھٹیاری ہے

ایمان اور صبر کی وادی سے جنت کی طرف جانا تھا مگر
کچھ ایماں کی کمزوری ہے کچھ صبر کا پتھر بھاری ہے

گر وقت کا دھارا ٹوٹ گیا پھر محفلِ ہست و بود کہاں
بہتے ہوئے دریا پر تو نے کیا سوچ کے لاٹھی ماری ہے

عابد رضا

غزل

بچے گا وقت کے ہمراہ نشاں ہمارا بھی
کہ ہم نے چھوڑ دیا ہاتھ سے کنارا بھی

جو غار ہم نے چنی چھپ کے بیٹھنے کے لیے
اُسی میں بیٹھا تھا منصف کہیں ہمارا بھی

منافع ڈھونڈتے پھرتے ہیں جو سرِ بازار
وہ خالی ہاتھ گئے گم ہوا خسارا بھی

گلہ اندھیرے کا برحق مگر یہ دیکھو تو
چمک رہا ہے کسی طاق میں ستارا بھی

یہ رسم و راہ کی ڈوری جو پڑ گئی کمزور
کہیں قصور تو ہو گا میاں تمھارا بھی

ہمیں یقین ہے قرآنی استخارے پر
کہ منع آیا ہے دیکھا تھا استخارہ بھی

یہ پیار دیار محبت یہ عشق وشق بھی ٹھیک
مگر یہ سچ ہے کہ تم ہو میرا سہارا بھی

جو بات حد سے بڑھی ہو گیا میں دستبردار
یوں میں نے توڑ دیا عشق کا اجارہ بھی

وہ بیٹھے بیٹھے اٹھا اُٹھ کے چل دیا اعجاز
بہت اشارے کیے، ڈور کر پکارا بھی

اعجاز رضوی

گلاب کا پھول

فرید، نعمان، ثالم اور ندیم بی اے پاس کرنے کے بعد ایم اے میں بھی ایک ساتھ تعلیم حاصل کر رہے تھے.... بلکہ ایک ہی سیکشن میں تھے... نعمان، ثالم اور ندیم کا بڑے رئیس گھرانے سے تعلق تھا مگر فرید ایک متوسط گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔

تینوں دوست جانتے تھے کہ یہ بڑی مشکل سے تعلیم حاصل کر رہا ہے.... لیکن فرید کی ماں نے اتنی اچھی تربیت کی تھی کہ کبھی اس کو احساس نہیں ہوا تھا کہ میں ان سے مالی معاملات میں کم تر ہوں.... مگر کبھی کبھی دوستوں کی باتوں سے جو اپنی بڑھائی کی باتیں کرتے تھے.... نئے ماڈل کی گاڑی لینے کی خواہش ظاہر کرنے اور اگر باہر کے ملک میں سیر کرکے آتے تو گھنٹوں وہاں کے مقامات کی داستان فرید کو سناتے...... وہ ہنس کر کہتا.... کمال ہے اتنا انجوائے کرکے آئے ہیں تو ایک آرٹیکل ہی لکھ لیتے.... تاکہ سب لوگ پڑھ کر انجوائے کرتے۔

انجوائے منٹ تو پڑھنے میں نہیں ملتی بڑی بڑی نئے ماڈل کی گاڑی خریدتے ہیں اور باہر کے ملکوں کی سیریں کرتے ہیں جو مزہ ان کو ملتا ہے وہ آرٹیکل میں کہاں۔ چلو میں یہ بات مان لیتا ہوں مگر آپ اس ملک کی روداد بطور سفرنامہ تو لکھ سکتے تھے۔

اچھا چھوڑو ان باتوں کو چلو کوئی اور بات کرو۔

نعمان نے کافی کا سپ لیتے ہوئے فرید سے کہا۔

یار تمھارا دل نہیں کرتا کہ میں باہر جاؤں اور خوب وہاں کی سیر کروں۔

’’نہیں‘‘

’’کیوں‘‘

میرا دل کرتا ہے کہ میں خوب پڑھائی کروں اور اپنے باپ کا نام روشن کروں۔

ثالم نے نعمان کی جگہ جواب دیا۔

ہمارے وسائل اتنے ہیں.... کہ ہمیں ٹیوٹر ایک نہیں بلکہ تین تین پڑھانے آتے ہیں.... اگر تمھارے گھر میں مدد کرنے والا نہ ہو تو تمھارا پاس ہو جانا بھی معجزے سے کم نہیں آئندہ

بلقیس ریاض

زندگی میں ہم تینوں کا ارادہ سی ایس ایس کرنے کا ہے...کیا تم بھی کرو گے۔
فرید نے سوچ کر جواب دیا....میں بھی قسمت آزما لوں گا کیا معلوم میں پاس ہو ہی جاؤں۔
ندیم جو قریب ہی بیٹھا تھا....برگر کھاتے ہوئے بولا۔
لیکن اس کے لیے بہت سارو پیہ درکار ہے کیونکہ جو ٹیوٹر پڑھانے آتے ہیں وہ تو بہت زیادہ ٹیوشن کے پیسے لیتے ہیں...سی ایس ایس تو تم تھوڑے پیسوں میں بھی کر سکتے ہو لیکن ٹیوشن تو یہ تو بہ بہت مہنگی ہے ....تمھارے والد تو اتنے پڑھے لکھے نہیں ہیں....چھوٹی موٹی بزنس کرتے ہیں گھر کا گزارہ بھی مشکل سے ہوتا ہوگا۔
فرید نے آہ بھر کر کہا۔
تم ٹھیک کہتے ہو....گزارہ مشکل سے ہی ہوتا ہے...ابا چاہتے ہیں کہ میں امتحان پاس کر کے ان کے کام میں ہاتھ بٹاؤں۔
ثالم نے جواب دیا۔
درست فیصلہ ہے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ فرید پڑھائی میں بہت لائق ہے اور بغیر ٹیوشن کے بھی سی ایس ایس پاس تو کر سکتا ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں تم ساتھ مل کر والد صاحب کے ساتھ کام کرو گے تو حالات بدل جائیں گے پھر شاید تم سی ایس ایس کر لو گے۔
ابا کی بڑی خواہش ہے....کہ میں ان کے کام میں ہاتھ بٹاؤں۔
نعمان نے فرید سے کہا۔
پاپا مجھے چار ٹیوشن رکھ دیں گے....اور کسی نہ کسی طرح میں کامیاب ہو جاؤں گا.... اور باقی کے دو دوست بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ تم کاروبار میں ہاتھ بٹاؤ.... پیسہ کمانا بہت ضروری ہے۔
ثالم نے کہا:
ابھی کچھ مہینے ہیں....یہ باتیں ہوتی رہیں گی کلاس کا وقت ہو گیا ہے چلتے ہیں۔ فرید گھر میں جا کر اپنے ابا کو خوش کر دو....اور خوب روپیہ کماؤ۔
فرید نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
بہت شکریہ....قسمت میں سی ایس ایس ہے یا کاروبار......یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور ان کے ساتھ کلاس روم میں چلا گیا۔
باپ کے پاس سکوٹر تھا اور وہ دو بسیں بدل کر یونیورسٹی میں آتا تھا....گھر جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ شاید میرے دوست صحیح کہتے ہیں.... روپیہ بہت ضروری ہے مگر مجھے تو بہت شوق ہے کہ میں سی ایس ایس کروں....لیکن اپنے والدین کو مشکل میں نہیں ڈال سکتا کہ وہ کوئی ٹیوشن مہیا کریں۔ ایم اے کی ڈگری حاصل کر لوں تو بڑی غنیمت ہے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ گھر پہنچ گیا...پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کاش ہمارے وسائل بھی اتنے ہوتے.... پلنگ پر لیٹا ہوا تھا دل میں ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔
آنکھیں بوجھل تھیں....سخت سردی میں ماتھے

پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ وہ نڈھال سا ہو گیا تھا... اور آنکھوں میں آنسو بے اختیار نکل پڑے۔
ماں (آسیہ) کو تشویش ہوئی اور وہ اس کے پاس آئی تو اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے... اور چہرے پر بے بسی چھائی تھی۔
"فرید"
ماں نے پکارا... کھانا بھی نہیں کھایا اور یہاں آ گئے ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا!
میں ٹھیک ہوں امی.... دوستوں کے ساتھ برگر کھا لیا تھا... "بھوک نہیں ہے"۔ آسیہ نے غور سے اس کی جانب دیکھا اور کہا۔
"تم تو رو رہے ہو.... خیر ہے"۔
جی امی میں بالکل ٹھیک ہوں۔
"پھر آنکھوں میں آنسو"
ماں نے کہا میں تمھاری ماں ہوں تمھارے چہرے سے مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تم اداس ہو۔
ماں کا اتنا ہی کہنا تھا کہ یک دم اس کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ رونے لگا۔
آسیہ بے چین ہو گئی۔
کیا ہوا میرے لال..... دوستوں سے جھگڑا ہو گیا ہے۔
نہیں.... اس نے روتے ہوئے کہا۔
"بس دل بھر آیا ہے"۔
"کیوں.... کیا وجہ ہے.... مجھے بتاؤ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے"۔

امی چار مہینے کے بعد امتحان ہو کر جب ڈگری مل جائے گی تو میرے تینوں دوست سی ایس ایس کر رہے ہیں... اور کہتے ہیں کہ تمھارے وسائل اتنے نہیں اپنے باپ کے ساتھ ان کا ہاتھ بٹاؤ۔
کہتے تو ٹھیک ہیں۔
مگر امی.... اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا میرا خواب ہے... اور کاروبار تو کبھی بھی کر سکتا ہوں.... لیکن تعلیم حاصل کرنے کا یہی وقت ہے۔
آسیہ نے اس کا منہ چومتے ہوئے کہا۔
فکر نہ کرو... تم بھی سی ایس ایس کرو گے۔
آج سے پچیس سال پہلے.... جب میری شادی ہوئی تھی...... تب تمھارے باپ کا کاروبار خوب وسیع تھا.... جو روپے مجھے گھر کے خرچ سے بچتے تو میں سونا خرید لیتی تھی... یہ سوچ کر کہ تم دونوں کی شادیوں میں کام آئے گا۔ وہ میں نے لاکر میں رکھا ہوا ہے..... بیٹی کے حصے کا سونا بینک میں ہی رہنے دوں گی.... ابھی تو وہ چھوٹی ہے اور باقی کا میں بیچ دوں گی۔ اگر تم کامیاب ہو گئے تو بغیر سونے کے ہی اچھے گھر کی لڑکی مل جائے گی۔
"سچ امی"
سچ..... یہ بات تو تمھارے ابا کو بھی معلوم نہیں ہے.... اپنے دوستوں سے ذکر مت کرنا اور امتحان میں تم ان شاءاللہ کامیاب ہو جاؤ گے۔
فرید کی آنکھیں چمک اٹھیں.... اور ماں کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے باورچی خانہ میں

چلا گیا۔
امتحان ہوئے اور چاروں دوست اعزازی نمبروں سے پاس ہو گئے اور عاشی ان کی کلاس فیلو بھی سی ایس ایس کرنا چاہتی تھی.... بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ ایک روز فرید کو کہنے لگی۔
فرید میں سی ایس ایس کرنا چاہتی تھی مگر اس کے پاپا نہیں مانتے ہیں....وہ جلد از جلد میری شادی کر دینا چاہتے ہیں....اور ان تینوں میں جس کی پوزیشن اچھی ہوئی پاپا نے اس کے ساتھ میری شادی کر دینی ہے۔
ہاں....میں دوست سمجھ کر مشورہ دینا چاہتی ہوں تم بھی امتحان دو....ہو سکتا ہے تم بھی کامیاب ہو جاؤ۔
دیکھوں گا....کچھ کہہ نہیں سکتا....ابا مجھے اپنے بزنس میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔
''وقت ضائع نہ کرو....اور امتحان تم بھی دو''۔ عاشی کا فون بند ہو گیا۔
فرید نے دل ہی دل میں سوچا۔
عاشی کتنی اچھی ہے....اتنے بڑے باپ کی بیٹی اور ذرا بھر غرور نہیں ہے''۔ پھر اس کے سحر میں ڈوب گیا....پھر دل ہی دل میں کہنے لگا کہ میں اس کے لائق نہیں ہوں.....کاش.....؟
وہ باہر لان میں ٹہلنے لگا۔ اس کے ذہن میں زور شور سے آندھیاں چلنے لگیں....اوپر آسمان کی طرف دیکھا تو بوندا باندی سفید موتیوں کی طرح زمین پر اترنے لگیں....یہ حسین نظارہ دیکھ ہی رہا تھا کہ آسمان کی بلندیوں میں ایک دریچہ کھل گیا...اور وہ پھولوں بھری وادیوں میں نکل گیا اور....اسے یوں لگا اس کی زندگی میں اندھیرے چھٹ سے گئے اور چارسو اجالا چھا گیا ہے....وہ مطمئن سا اندر گیا....اور ماں سے لپٹ گیا۔
آپ مجھے دعا دیں.... میں کامیاب ہو جاؤں....اور ماں کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور....فرید کا منہ چومتے ہوئے کہا۔
میرا بچہ ضرور کامیاب ہوگا۔ ماں کی محبت اس کے وجود کے روئیں روئیں پر دوڑ گئی....اور فرید کی آنکھوں میں امید کے پھول کھلنے لگے۔
وہ دن رات....محنت میں جت گیا....
ندیم، نعمان اور تالم کے والدین نے چار چار ٹیوٹر ان کے رکھ دیئے...روپے پیسے کی ان لوگوں میں کمی نہیں تھی بس بچوں کا سٹیٹس ہائی کرنے کے لیے....اور ملک میں خوشگوار زندگی بسر کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ایسی پوسٹ پر وہ سروس کر سکیں تاکہ لوگ ان کے آگے پیچھے پھریں۔
فرید کو تینوں اپنی کارگزاری بتاتے۔
ندیم نے اسے کہا۔
میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ سی ایس ایس کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ بڑی غلطی کی کہ تمہیں کاروبار پر لگانے کا مشورہ دے دیا ہم نے لیکن بات وہی ہے.... وسائل.... کی کمی.... چلو روپیہ خوب بناؤ...اتنی مہنگائی

ہے.... اور روپے کے بغیر جینا بڑا دشوار ہے۔ تم ہمیں فون ہی نہیں کرتے جب بھی کریں... ہم ہی کرتے ہیں۔ اتنی کیا مصروفیت ہے۔

"بس اپنے پسندیدہ کام میں لگ گیا ہوں"۔

"اچھا ہے"

ایک دوست کاروباری بھی ہونا چاہیے۔ مگر جلد ہی اپنی بزنس کو چمکاؤ.... اور اچھی جگہ پر گھر لے لوتا کہ ہمیں آنے میں دشواری نہ ہو۔ اس نے دھیمے سے لہجے سے جواب دیا۔

ایسا وقت جلد آئے گا۔

فرید جانتے ہو.... عاشی ہم تینوں کو ہی بہت پسند ہے.... ہم نے یہ طے کیا ہے کہ جس کا وہ ہاتھ پکڑے گی... باقی کے دو دوست برا نہیں مانیں گے۔

یہ تو بڑی اچھی بات ہے.... تم تینوں کی دوستی سدا قائم رہے گی۔

ارے بدھو.... تین نہیں چار.... کیا ہوا.. تمھارا سٹیٹس اتنا بڑا نہیں ہو گا۔ مگر تم ہمارے دوست ہی رہو گے۔ کیا سی ایس ایس کے بعد بھی مجھے اپنا دوست سمجھو گے کہ نہیں۔

کیسی بات کرتے ہو..... دوست دوست ہی ہوتا ہے..... بس تمھیں وقت لے کر آنا پڑے گا۔

فرید نے پریشان ہو کر فون بند کر دیا اور اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔

وقت گزرتا گیا... فرید نے ٹیوشن تو نہ رکھی مگر... جان پہچان کے لوگوں سے رہنمائی کرتے ہوئے... کئی سالوں کے سوالوں کو بھرپور طریقے سے غور و خوض کرتے ہوئے.... اللہ سے دعا مانگتا رہا کہ ان میں سے پھر کوئی ایسا سوال آ جائے... اس نے ان تھک محنت سے تمام پرانے سالوں کے پیپرز کو حل کر لیا...... مگر پھر بھی مطمئن نہیں تھا... اپنے طور پر بھی پڑھائی کرتا رہا.... ایم اے انگلش کرنے کی وجہ سے.... وہ بخوبی انٹرویو کی تیاری کر سکتا تھا مگر... ایک خوف دامن گیر تھا۔ اگر written میں پاس ہو گیا تو... انٹرویو میں ناکام ہوا تو وہ پاس نہیں ہو سکے گا۔ باپ اس کو محنت کرتے دیکھ کر کہتا... جس نوکری کے لیے اتنی محنت کر رہا ہے.... اس نے کیا دینا ہے.... حالات ہمارے تھوڑے سے بدلیں گے ضرور.... مگر دن بدن جو مہنگائی بڑھ رہی ہے.... حالات ویسے ہی ہو جائیں گے۔ کاروبار میں یہی روپیہ لگائیں گے تو ہمیں کافی فائدہ ہو گا۔

ابا پلیز... بس امتحان میں کچھ ماہ رہ گئے ہیں... اگر پاس نہ ہوا تو آپ کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹاؤں گا اور ہو سکتا ہے آپ کا بزنس پہلے جیسا ہو جائے۔ باپ خاموش ہو جاتا اور آسیہ اس کو کہتی۔

اللہ پر بھروسہ رکھو.... وہی تمھارا نگہبان ہے... اور اللہ کے سوا کوئی مدد نہیں کرے گا۔

فرید تشکر بھری نگاہوں سے ماں کو دیکھتا....

اور پھر ایک روز نعمان کا فون آیا فرید آج ہم

کافی پینے کے لیے ایم ایم عالم روڈ پر جا رہے ہیں... پڑھ پڑھ کر بور ہو رہے تھے... فوراً فلاں جگہ پہنچ جاؤ۔

کافی دن ہو گئے ہیں ہم مل نہیں سکے۔

ٹھیک ہے... اسی کافی شوپ پر جہاں ہم جایا کرتے تھے.

بالکل وہی۔

فرید نے احتیاطاً کچھ روپے ماں سے لیے اور وہاں پہنچ گیا۔ اس وقت کافی شاپ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا... عاشی بھی وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ فرید کو دیکھ کر بولی۔

شکر ہے فرید تم آ گئے ہو... اب مجھے اور تمہیں دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

فرید نے اس کی جانب دیکھا۔

عاشی کی سحر انگیز آنکھیں اور بھرپور چمک اس کے دل میں اترتی چلی گئی۔ فرید نے یک دم اپنے آپ کو سنبھالا اور پوچھا۔

کیسی دشواری۔

ارے جب یہ اپنی پوسٹ پر ہوں گے... تو نہ ملنے کے بہانے کریں گے اور اگر بلایا بھی تو پہلے وقت لینا پڑے گا۔ فرید نے ان کی سائڈ لیتے ہوئے کہا۔

نہیں... تم غلط کہتی ہو... ہم چاروں بہت گہرے دوست ہیں... ملتے رہیں گے۔

ثالم نے کہا۔

دراصل آجکل لوگ جہاں فائدہ ہوتا ہے اور کام نکلوانا ہوتا ہے وہاں ملتے ہیں... اور جہاں مطلب نہ ہو ملتے نہیں۔

فرید نے اسے کہا۔

”بھئی مجھے تو مایوس نہ کرنا“۔

ندیم نے کہا۔

فرید... تم سے بغیر غرض کے مل لوں گا... اگر نہ مل سکا تو سمجھ لینا کوئی مجبوری آڑے آ گئی ہے۔

عاشی نے جواب دیا۔

اگر میں سی ایس ایس کرتی تو اپنے سب دوستوں کو خندہ پیشانی سے ملتی... ثالم نے ہنس کر کہا۔

واہ... جی واہ... تمہارے میاں نے ملنے ہی نہیں دینا تھا۔ عاشی نے اپنی آنکھیں فرید کے چہرے پر گاڑ دیں۔

تو وہ لرز گیا۔ یوں لگا... کڑی دھوپ میں بادل چھا گئے۔ زندگی تپتے ہوئے صحرا میں سرسبز درختوں سے ڈھکی چھاؤں سے وادی وادی آ گئی ہو۔ وہ ہنس پڑی... میرا میاں کھلے ذہن کا ہوگا۔ فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔

فرید نے جواب دیا... پہلے امتحان تو پاس کر لو... پھر دیکھا جائے گا۔ اگر مل لیں گے تو مہربانی ہوگی ورنہ ہم اپنی دنیا میں مست رہیں گے۔ عاشی نے والہانہ نگاہوں سے دیکھا۔

تو فرید کو معلوم ہوا کہ اس کے اندر مہکتا ہوا رنگا رنگ موسم ٹھہر گیا ہو۔

پھر عاشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر میں اور فرید بے تکلفی سے مل لیا کریں گے باقی تو تینوں سول سروس میں جاب کر رہے ہوں گے... ان کو تنگ نہیں کریں گے.

نعمان نے کہا۔

اگر ایسی بات ہوتی تو تم دونوں کو کافی کے لیے نہ بلواتے۔
عاشی نے ہنستے ہوئے کہا۔
ابھی تم اپنی پوسٹ پر نہیں کھڑے ہوئے تو جب کھڑے ہو گے تب کی بات کرو۔ تب دیکھتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔
ثالم نے مسکراتے ہوئے کہا۔
یہ ٹھیک کہا ہے تم نے.....نہ جانے کتنے مصروف ہو جائیں۔ چھوڑیں کافی پئیں.....سب ہنسنے لگے.....اور بہت دیر تک محو گفتگو رہے۔
آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا.....امتحان ہوا.....انٹرویو کا دن مقرر ہوا.....وہ بھی مرحلہ گزر گیا.....اور اب سب کو رزلٹ کا انتظار تھا۔
آسیہ بیگم مصلے پر بیٹھ کر گڑگڑا کر اللہ سے دعائیں مانگ رہی تھیں.....اور کہہ رہی تھیں.....اللہ تیرے سوا کوئی مددگار نہیں.....میرا بچہ آنکھوں کی ٹھنڈک، وفادار، تابع دار ہے.....تو مدد فرما۔
رزلٹ آ گیا.....تو ان میں ثالم، نعمان اور ندیم کی پوزیشن.....کافی فرید سے نیچے تھی مگر..... فرید نے پورے پاکستان میں فرسٹ پوزیشن لے کر.....اپنے باپ دادا کا نام روشن کیا۔
تینوں دوست اور عاشی کی آنکھیں حیرانگی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ فرید کا نام سن کر فوراً فون پر مبارکبادیں دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے تم تو چھپے رستم نکلے.....اور باری باری حیرانی سے اس کے گھر میں کیک، مٹھائیوں اور پھل کے ٹوکرے لے آئے تھے.....انھیں گھر سے تربیت ملی تھی تعلق گہرا کرنے کے لیے.....کسی طرح اونچی سیٹ پر بیٹھے شخص کی خوشامد کی جاتی ہے۔
عاشی کے والد اس کی شادی کرنے کے لیے بضد تھے... اور تینوں کو عاشی نے reject کر دیا اور کہا کہ میں فرید سے شادی کروں گی۔ باپ نے کہا۔
ان کے وسائل اتنے نہیں تو عاشی نے جواب دیا اگر یہ سی ایس ایس نہ بھی کرتا تو میں نے اسی سے شادی کرنی تھی۔
لیکن لوگ کیا کہیں گے۔
لوگ تو خوش ہوں گے سول سروس والے نوجوان سے شادی کی ہے۔ عاشی کے والد ہاشم صاحب نے بیٹی کی خوشی کی خاطر رشتہ استوار کر لیا۔ جب سب معاملات طے ہو گئے تو انھوں نے بہت بڑے ہوٹل میں منگنی کا انتظام کیا.....عاشی اور فرید کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔
اور دوست کہہ رہے تھے.....یار.....ملتے رہنا.....ہم گہرے پکے دوست ہیں - وہ مسکراتا رہا.....عاشی سٹیج پر بیٹھی.....گلاب کے پھولوں کے گرد تر و تازہ مہکتا ہوا گلاب لگ رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

ملکہ اِک ویرانے میں

پندرہ اگست کی اُس رات کا پہلا پہر حبس سے بھرپور تھا۔ میں نے ٹرین کی کھڑکی سے پلیٹ فارم پر نظریں دوڑائیں۔ گاڑی کی رفتار بہت آہستہ ہو چکی تھی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے لوگ آسانی سے پہچان میں آ رہے تھے پر میرے جگر گوشے کہیں نہیں تھے۔ گاڑی رُکی۔ میں جست لگا کر باہر کودی اور دیوانہ وار اپنے سامنے بھاگنے لگی تھی۔ مجھے بہت دُور اپنے چھوٹے بیٹے کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ میرا کہیں تصور تو نہیں ہے کہ مجھے ان عُمروں کی ہر صورت پر اب اُن کا گمان پڑنے لگا ہے۔ پر نہیں وہ سچ مچ میرے بچے تھے جو اپنے باپ کے ساتھ مجھے لینے آئے تھے کیونکہ اُن کی ماں شمالی علاقوں کی سیاحت سے کوئی بیس (20) دن بعد لوٹی تھی۔ چیختے چلاتے وہ سب مجھ سے لپٹ گئے تھے اور جب نصف ماہ سے زائد کی جدائی کا سُوکھا پن اس ملاپ سے کچھ سیراب ہوا تب اُنھوں نے گردنیں اُٹھا اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں اُن کی نظروں کا مفہوم پہچانتی تھی وہ جاننا چاہتے تھے کہ میں اُن کے لیے کیا لائی ہوں؟ میرے کندھے پر بیگ تھا جس میں فقط میرے دو جوڑے کپڑوں کے اور غالباً دو تین سو روپے کی ریزگاری ہوگی۔

میں نے اپنے چھوٹے بیٹے کے گال چُومے اور کہا۔

”میری جان سکردو کے عنبری سیب ابھی کچے تھے۔ خوبانیوں کا موسم ختم ہو گیا تھا۔ ثُوت تو مئی میں ہی مُک مُکا جاتے ہیں۔ چلو میں تمھیں راستے میں سے جو کہو گے خرید دیتی ہوں۔“

میں اُنھیں بتانا چاہتی تھی کہ میں ڈھیر سارا روپیہ بلتستان کی وادیوں میں کرائے بھاڑوں میں ختم کر آئی ہوں اور اب بمشکل گھر تک پہنچی ہوں۔ راستے میں ایک جگہ گاڑی روک کر میرے میاں نے پھل خریدا کہ گھر میں دیورانیوں کے بچے بھی انتظار میں تھے۔

”آخر آپ وہاں سے کیا لائی ہیں؟ اتنے

سلمیٰ اعوان

وعدے کر کے گئی تھیں اور خالی ہاتھ لٹکائے آگئی ہیں۔'' بڑا بیٹا چیخا۔

''دیکھو بہت سی کہانیاں لائی ہوں۔ سچی، تاریخی، بے حد دلچسپ اور پیاری پیاری۔

اُس رات بیٹی نے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ بیٹے سرہانے پائنتی بیٹھ گئے کہ چلو اب سناؤ جولائی ہو۔''

اور میں نے اُن رُوح پرور نظاروں اور رنگا رنگ کہانیوں کے دامن میں جھانکا اور یوں گویا ہوئی۔

''بس تو من و عن وہی نظارہ تھا۔ شام کے گھنے بادلوں میں جب دفعتہً بجلی چمکتی ہے اور اردگرد کا سارا ماحول روشن ہو جاتا ہے۔ اس وقت میں خپلو بالا میں پرانے محل کی بیرونی سیڑھیوں سے چھلانگیں مارتی ہوئی اس کچی جگہ آ کر ٹھہری تھی جس کے مشرقی طرف نیا محل اور اس سے ملحقہ چھوٹا باغیچہ، مغربی سمت بڑے باغ اور بیگم فتح علی خاں کے کمروں کی طرف جانے کا راستہ، جنوب میں پرانا محل اور شمال میں مزید سیڑھیاں اور شکستہ کمرے تھے۔ بس اُسی کچی جگہ پر جو مُجھ سے کوئی چار فٹ کے فاصلے پر تھی کڑکتی بجلی لشکارے پر لشکارے مار رہی تھی۔

میں ہٹر ہٹر آنکھوں کے پٹ پھاڑے اُسے دیکھتی تھی جس کے گھٹاؤں جیسے سیاہ بال کانوں کے پاس پاس دو چوٹیوں کی صورت تیز گلابی ریشم کے پراندوں میں گندھے کمر اور سینے پر جھول رہے تھے۔ تائیوان کا مہندی رنگا چھوٹے چھوٹے پھولوں والا خوب صورت چمکتا سوٹ جس کی شلوار کے پائنچوں تلے ایرانی پلاسٹک کا جوتا گورے گورے گداز پاؤں کو مقید کیے کھڑا تھا۔ میں ہیروں کی بہت سی اقسام سے شناسائی حاصل کر بیٹھی ہوں۔ اسی لیے حق بجانب ہوں کہ اگر کہوں اُن آنکھوں سے پھوٹتی کرنیں ہیروں کی چمک لیے ہوئے تھیں۔

''کون ہیں آپ؟''

''میں ایک سیاح جسے وطن کی دلکش وادیاں اپنے نظاروں سے محظوظ کرنے کے لیے کھینچ لائی ہیں۔''

''اور آپ؟'' میں نے استفہامیہ نظریں اس پر گاڑ دیں۔

''شاہ جہاں۔ خپلو کے شاہی یبگو خاندان کی بہورانی۔''

میں نے دیکھا تھا اس کی تنی گردن جواب دیتے ہوئے کچھ اور تن گئی تھی میں ہنسی اور بولی۔

''لگتا ہے آپ کا نام بہت عجلت میں رکھا گیا یا پھر کسی نے غور ہی نہیں کیا؟''

''کیا مطلب؟'' اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔

''بھئی آپ تو نُورجہاں ہیں۔''

اب اُس کے ہنسنے کی باری تھی۔ وہ ہنسی اور میری طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے دوستانہ انداز میں بولی۔

''تو آیئے پھر آپ کو چائے پلواتے اور راجہ

فیملی سے ملواتے ہیں۔"

میرے ساتھ اس وقت چلو سول ہسپتال کے ڈاکٹر اسماعیل کا چھوٹا بھائی یوسف تھا۔ شاہ جہان نے یوسف سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اب وہ جائے اور یہ کہ ان کا نوکر مجھے چھوڑ آئے گا۔

یوسف نے میری طرف دیکھا۔ مجھے کچھ خفت سی محسوس ہوئی۔ بے چارے کو گائیڈ بنا کر ساتھ لائی تھی۔ اب راستے ہی سے وداع کر رہی تھی۔ مجبوری تھی۔ میں نے عاجزی سے کہا۔

"یوسف میں مغرب تک آجاؤں گی۔ ڈاکٹر صاحب کو بتا دینا۔"

ساری راجہ فیملی بڑے کمرے میں جمع ہو گئی تھی۔ راجہ کھرمنگ کی والدہ فاطمہ بیگم بھی کھرمنگ سے ایک شادی کے سلسلے میں آئی ہوئی تھیں۔ بھتیجے بھتیجیوں اور بھاوج نے روک لیا تھا۔

حسین ماضی مہارانی کھرمنگ کی آنکھوں سے چھلک چھلک پڑتا تھا۔ شاہ جہان کی ساس مہارانی خپلو بھی پاس بیٹھی تھیں۔ میں نے ان آنکھوں میں جھانکا اور پوچھا۔

"جاگیرداری ختم ہونے سے کیسا محسوس ہوتا ہے؟"

لہجے میں زمانے کا درد سمٹ آیا تھا۔

"حال تو بہت تکلیف دہ ہے۔ خیر اب عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ درد کتنا ہی کیوں نہ بڑھ جائے آخر کار دوا بن جاتا ہے۔"

شاہ جہان پلیٹ میں امنبہ خوبانیاں لائی، سفید، رسیلی خوبانیاں۔ زبان پر رکھو اور گھلتی ہوئی حلق میں اُتر جائیں۔

میں کھاتی گئی اور فاطمہ بیگم کی باتیں سنتی گئی۔ پھر چائے آ گئی۔ نمکین سبز چائے۔ باہر شام اُتر رہی تھی مہارانی خپلو ایک مورت کی مانند بیٹھی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گھونٹ سے چائے پیتی تھی۔

اور جب شاہ جہاں گود کی بچی کو لیے میرے پاس آ کر بیٹھی اس نے کہا۔

"یہ ہماری چچی مارجوری بلز کی منجھلی بہو ہے۔" کمرے میں ایک نوعمر دلکش لڑکی داخل ہوئی تھی۔

"مارجوری بلز" یہ نام میں نے گلگت میں سنا۔ اس نام سے میرے کان ہنزہ میں آشنا ہوئے اور جب میں سکردو آئی تو راجہ افتخار علی خاں اور مارجوری بلز کے نام ایک بار پھر سماعت سے ٹکرائے اور جب میں نے کوہ ہندوکش اور کوہ قراقرم کی وادیوں کے بارے میں پڑھنا شروع کیا تھا یہ نام وہاں بھی موجود تھا۔

شاہ جہان کے ساتھ میں باہر نکل آئی تھی۔ چیڑ کی لکڑی کے تختوں سے بنی راہداری جس کے چوبی جنگلے پر کہنیاں ٹکائے میں اپنے سامنے جھاگ اُڑاتے شفاف پانی کے چشمے کو شور مچاتے دیکھ رہی تھی۔ کچے پیلے رنگ کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ناک میں گھس کر عجیب سی لطافت پیدا کرتی تھی۔ ان پھولوں کے بارے میں جب میں نے پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ کشمیر سے

لا کر لگائے ہیں۔

پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی برف پر سے آتی ہوائیں اب بہت خنک ہو گئی تھیں۔ تب میں نے کہا۔

”شاہ جہان اپنی مرحوم چچی مارجوری بلز کے متعلق کچھ نہیں بتاؤ گی؟“

”سامنے دیکھو!“ اس نے دور پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

”دیکھ رہی ہوں۔ بولو۔“ سینکڑوں فٹ اُونچے اُس پہاڑ پر میری نظریں جم گئی تھیں۔

اس پہاڑ پر خپلو کا تاریخی قلعہ اور محل ہے۔ یہ تھور سے کھر کہلاتا ہے۔ قلعہ تو کھنڈر بنا پڑا ہے پر مسجد جوں کی توں ہے۔ کل وہاں چلیں گے اور تمہیں میں وہیں وہ کہانی سناؤں گی جو سچی ہے اور تاریخ کے سینے میں محفوظ ہے۔

میں نے سہم کر ایک بار پھر اپنے سامنے اس پہاڑ کو دیکھا جو ایک دیو ہیکل جن کی طرح پر پھیلائے کھڑا تھا اور جس پر ”تھور سے کھر“ کا شکستہ قلعہ اور محل واقع تھا اور جہاں جا کر وہ ہٹ طناز اُس الف لیلوی داستان سنانے کا کہہ رہی تھی جسے سُننے کی میں زبردست خواہش مند تھی۔

”کمال ہے۔ تم فضا میں معلق ہوئے بغیر یہ کہانی نہیں سنا سکتی ہو۔“

”لو بھی اور افسانے سے زیادہ دلکش کہانی کی تم اتنی سی قیمت نہیں دے سکتی ہو کہ خود چل کر اُن جگہوں کو دیکھو جو اُسے بہت محبوب تھیں۔ پہاڑ کے پچھلی طرف ہماری زمینیں ہیں۔ چچی مارجوری ان دنوں اوپر جایا کرتی تھیں۔“

مغرب کی اذان نے گفتگو اور سوچوں کے سارے راستے بند کر دیئے تھے۔ میں نے سر پر دوپٹہ لیا اور نماز کے لیے چل دی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر جب میں نے اُسے کہا۔

”سنو! ڈاکٹر اسماعیل میرا انتظار کرتے ہوں گے۔ مجھے واپس بھجواؤ اب۔“ اور وہ پری جمال ایک ادا سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”اس اندھیری رات میں اس وقت تم نے باہر نکل کر کیا اپنے گٹے گوڈے تڑوانے ہیں۔ دوستی کر لی ہے میں نے تم سے بھول جاؤ اب ڈاکٹر اسماعیل کو۔ جتنے دن خپلو میں رہو گی میرے پاس رہنا ہوگا۔ میرا بیٹا ڈاکٹر اسماعیل کو بتا آیا ہے۔“

رات کو نئے محل کے بڑے کمرے میں راگ ورنگ کی محفل جمی۔ شاہ جہان بتا رہی تھی کہ ابھی پندرہ دن پہلے لاہور کالج کی پروفیسروں کا ایک گروپ خپلو آیا تھا اور اسی کمرے میں اُس رات بھی ایسا ہی ہنگامہ برپا ہوا تھا۔

صبح فجر کی نماز کے بعد میں رضائی میں دبک کر پھر سو گئی تھی۔ نو بجے کے قریب شاہ جہان نے ریشمی رضائی میرے اوپر سے کھینچ کر کہا۔

”کچھ خوف خدا کرو۔ چلنا نہیں کیا؟ ڈیڑھ گھنٹہ چڑھائی میں لگے گا۔ ادھر پار گاؤں میں بھی جانا ہے۔“

شاہ جہان نے چھوٹی بیٹی کمبل میں لپیٹ کر چورونگ (تنکوں کی لمبی ٹوکری) میں لٹائی اور اسے کمر پر کس لیا۔ میں نے چائے کی بوتل، کپ، پراٹھے اور انڈے ٹوکری میں ڈالے اور اسے شاہ جہان کی طرح کمر پر لادا اور جب وہ اس کی طنابیں درست کر رہی تھی میں نے کہا۔

"شاہ جہان تم نے یہ من پکا وزن بھی مجھ پر لاد دیا ہے۔ اگر کہیں میرا پاؤں رپٹ گیا تو یاد رکھنا میرا خون تیری گردن پر ہوگا۔"

اس چلبلی نار نے تیکھی نظروں سے مجھے گھائل کرتے ہوئے کہا۔

"اوکھلی میں سر دیتی ہو اور موسلوں سے بھی ڈرتی ہو۔ وطن کے دشوار گزار حصے دیکھنے اور ان کے بارے میں لکھنے کا شوق بھی ہے اور راستوں کی صعوبتوں سے خوفزدہ بھی ہو۔ چلو سیدھی طرح اور ہاں تمہارے کون سے مرنے کے دن ہیں؟ دنیا تھوڑی پڑی ہے اس نیک کام کے لیے۔"

شاہ جہان ان لوگوں میں سے تھی جن کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے:

کتنے حسین لوگ تھے جو مل کے ایک بار
آنکھوں میں جذب ہو گئے دل میں سما گئے

....

اس نے سارے فاصلے مٹانے میں صرف چند گھنٹے لیے تھے۔

فضا میں خفیف سی خنکی تھی۔ میرا جسم لپینہ لپینہ ہو رہا تھا۔ پہاڑ ایسا عمودا تھا کہ جب میں ذرا آنکھ کی خفیف سی جھری سے دائیں بائیں جھانکتی تو لمحے بھر کے لیے مجھے اپنا خون جیسے رگوں میں منجمد سا محسوس ہوتا۔ شاہ جہان آگے آگے باتیں کیے جا رہی تھی۔

"تھورسے کھر" پر پہنچ کر جب میں نے دیکھا تو مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ جنھوں نے اسے بنایا انسان تھے یا جن۔ اللہ منوں وزنی پتھر کیونکر ان عمودی پہاڑوں پر لائے گئے ہوں گے؟

پھر اس نے چورونگ میں سے بچی کو نکالا اور پتھروں کے پاس ایک ہموار سی جگہ پر لٹا دیا۔ وہ کم بخت ابھی تک سو رہی تھی۔ معلوم نہیں کیا افیون کھلائی ہوئی تھی اسے۔ جب میں اور وہ دونوں اس نکھری اور روشن فضا میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لطف اٹھاتے ہوئے چائے پی رہی تھیں۔ سامنے دریائے شیوق چاندی کی طرح ایک لمبی لکیر کی مانند چمکتا تھا اور نیچے خپلو بالا اور خپلو پائن کے گھر گڑیوں کے گھروندوں کی مانند نظر آتے تھے۔

شاہ جہان نے ماضی میں چھلانگ لگا دی تھی۔

وہ اس وقت بانکپن، وجاہت، دلآویزی اور حسن و جمال کے آخری زینے پر کھڑا تھا۔ سچی بات ہے راجہ افتخار علی خان خپلو کے شاہی خاندان کی انگوٹھی کا وہ بیش قیمت ہیرا تھا جس کے بغیر انگوٹھی دو کوڑی کی رہ جاتی ہے۔ ترک نسل کی ساری خصوصیات اس کے وجود میں سمٹ آئی تھیں۔ وہ سرینگر کی گلیوں کا ہار سنگار تھا۔ ایس۔ پی کالج سرینگر کا طالب علم

جو کالج اور ہوسٹل ہر جگہ اپنے حسن و جوانی کی بنا پر غیر معمولی شہرت رکھتا تھا۔

یہ جاتی بہاروں کی ایک رنگین سی شام تھی۔ چناروں کے پیڑوں پر کھلے پھولوں نے فضاؤں اور دلوں میں ایک آگ سی لگا رکھی تھی۔ بارش ابھی ابھی برسی تھی اور فضا میں بادلوں کے ٹکڑے یوں تیرتے پھر رہے تھے جیسے جھیلوں کے نیلگوں پانیوں میں گلیشیر کے چھوٹے چھوٹے تودے۔

اس شام راجہ افتخار اپنے جگری یار کے ساتھ اٹیلین کیفے کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ چھ فٹ سے نکلتی قامت پر ڈارک بلیو سوٹ، سُرخ نکٹائی اور سیاہ چم چم کرتے جوتے۔ دروزاہ کھول کر وہ جس انداز میں اندر آیا تھا اور بیروں نے جس انداز میں اُسے تعظیم دی تھی وہ پرنس آف ویلز نظر آتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ واقعی وادی جہلو کا شہزادہ تھا۔

مارجوری بلز ایک برطانوی دوشیزہ جو لندن سے سیر و سیاحت کے لیے ہندوستان اپنے عزیزوں کے پاس آئی تھی۔ مدراس میں اپنی حقیقی خالہ کے پاس دو ماہ رہنے کے بعد وہ ابھی ایک ہفتہ ہوا اپنی پھوپھی مسز ولیم کے پاس سرینگر آئی تھی اس وقت وہ کیفے کے ایک کونے میں بیٹھی کافی سے دل بہلاتی تھی۔ مسز ولیم جموں گئی ہوئی تھی۔

افتخار، غلام وزیر مہدی ممبر سابق مجلس شوریٰ اور سلطان ڈوپٹہ آف کشمیر تینوں لنگوٹیئے یار ایک میز کے گرد بیٹھے، بیروں نے چائے کی سروس دی۔ وہ کپ ہاتھوں میں تھامے باتیں کرتے تھے جب مارجوری اپنی جگہ سے اُٹھی ان کے پاس آئی اور افتخار کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ عظیم برطانیہ کے کس حصے سے ہیں؟''

افتخار بڑا شوخ و شنگ جوان تھا۔ ہنسی ہونٹوں میں دبا گیا تھا۔ چہرے پر زمانے بھر کی معصومیت لاتے ہوئے بولا۔

''آپ کو کہاں کا نظر آتا ہوں؟''

''سکاٹ لینڈ۔'' مارجوری نے فوراً کہا۔

''بس تو ٹھیک اندازہ لگایا آپ نے۔ میں وہیں کا ہوں!''

''میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟'' مارجوری بولی۔

''ضرور ضرور شوق سے۔''

پر غلام وزیر مہدی سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور یوں بھانڈا پھوٹ گیا۔

سلطان ڈوپٹہ نے افتخار کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''معاف کیجیے گا محترمہ میں نے سکاٹ لینڈ چھوڑ سارا انگلستان دیکھا ہے۔ اس جیسا انمول ہیرا تو وہاں ایک بھی نہیں۔ یہ ہندوستانی مسلمان ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔''

''اوہ۔'' کہتے ہوئے مارجوری نے کندھے اُچکائے اور بولی۔

''میں نے ایسا حسین مرد آج تک نہیں دیکھا۔''

غلام وزیر نے بلتی زبان میں ہنس کر کہا۔
"لو افتخار اب لونڈیا ہوئی عاشق۔"
مارجوری اس وقت بالی عمریا کے دور میں تھی - سبز آنکھیں شراب کے چھلکتے پیمانے تھے۔
اگلے دن جب افتخار پھر کیفے گیا۔ مارجوری اپنی پھوپھی مسز ولیم کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ مسز ولیم نے افتخار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور ہونٹوں کو گولائی میں لاتے ہوئے بولی۔
"ہاؤ ڈیشنگ۔ مارجوری نے کل رات اور آج سارا دن تمھارا ذکر کر کے میرے جذبہ تجسس کو اتنا شدید کر دیا تھا کہ میں کیفے بھی وقت سے پہلے پہنچ گئی۔ میرا خیال ہے کہ مارجوری تعریف کرنے میں سو فیصد حق بجانب تھی۔"
اب ہوا یہ --- اس سے آگے کہانی کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ شاہ جہان کی بیٹی جاگ گئی تھی۔ اس نے اسے گود میں لٹایا اور دودھ پلانا شروع کر دیا۔
مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے کپڑا پھیلایا - انڈے پراٹھے نکالے اور ہم دونوں نے کھانا شروع کر دیا۔ سر پر سورج چمک رہا تھا۔ جب ہم نیچے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے یہ دیوتا "تھورسے کھر" کی چوٹی پر لٹکا ہوا ہے۔ وہاں پہنچیں گے تو ہاتھ بڑھا کر اسے توڑ لیں گے۔ پر وہ اتنا ہی اونچا پھر تھا۔
اور جب اس نے کھانے کے بعد چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا تب پھر بولی۔

"اب ایک گھمبیر مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ چلو کے اس حسین شہزادے کی محبت کے دو دعویدار پیدا ہو گئے تھے۔ بھتیجی کے ساتھ ساتھ اس کی سگی پھوپھی مسز ولیم جو افتخار کو سمولچا نگل جانا چاہتی تھی۔ جو اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر جھٹکے دیتی اور کہتی افتخار تم جان نہیں پاؤ گے کہ میں تمھیں کتنا پیار کرتی ہوں۔
پر افتخار فلرٹ کرنے والا نوجوان نہیں تھا اور نہ ہی وہ ایسی باتوں کو پسند کرتا تھا۔ اُس کے لیے یہ صورتِ حال انتہائی تکلیف دہ تھی۔
ایک دن جب مسز ولیم کسی اہم کام کے سلسلے میں جموں گئی ہوئی تھی مارجوری افتخار سے ملنے آئی - دونوں ایک پارک کے ویران سے گوشے میں بیٹھ گئے۔ مارجوری نمناک آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔
ساری صورت حال اس کے سامنے تھی۔ اس کی پھوپھی ایسی چنڈال اور بااثر شخصیت تھی کہ اُس کے ہوتے ہوئے وہ افتخار کو اپنانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔
دفعتاً آنسو اس کی سبز آنکھوں سے موتیوں کی طرح بہنے لگے۔ افتخار نے انھیں اپنے ہاتھوں سے صاف کیا۔ اُس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑا اور بولا۔
"مارجوری تمھیں اس ترقی یافتہ آسائشوں سے پُر ماحول سے بہت دُور ایک پس ماندہ علاقے میں جہاں زندگی کی بیشتر

سہولتیں حاصل نہیں رہنا ہوگا۔ کیا تم رہو گی؟

مارجوری نے گیلی آنکھوں کو لانبی پوروں سے صاف کیا اور بچے جیسی معصومیت سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''رہوں گی!''

جب اس نے یہ کہا تھا کہ میں رہوں گی۔ افتخار کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کے چہرے پر قندیلیں جل اُٹھی ہوں۔

افتخار نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھایا۔ اپنے سینے سے لگایا اور پوچھا۔

''مارجوری تمھیں اپنا مذہب تبدیل کرنا ہوگا۔ کروگی؟''

اور اس نے اس کے سینے پر سر مارتے ہوئے کہا۔

''میں کروں گی۔''

تب افتخار جھکا اس نے اُس کے بالوں پر پیار کیا اور اس کی پیشانی پر ایک طویل بوسہ دیتے ہوئے بولا۔

''مارجوری تمھیں پردہ کرنا ہوگا۔ کروگی؟''

''سب کچھ کروں گی۔ تم کہوگے تو آگ میں کود جاؤں گی۔''

اور افتخار نے اس کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے ہنس کر کہا۔

''نہیں جانِ افتخار آگ میں نہیں چلو کے محل میں کودنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

پر ماجوری ان سب کے باوجود فکر مند تھی۔ یہ فکر اُس کی آنکھوں میں جھلملاتا تھا، اُس کے چہرے پر لکھا تھا۔ اُس کی سوچوں میں نمایاں تھا۔

''افتخار تم مجھے کیسے حاصل کروگے؟۔ یہ انگریز کا دورِ حکومت ہے۔ کہیں تمھیں نہ کچھ ہو جائے!''

''ارے احمق! بھلا مجھے کیا ہوگا؟ گھبرایا مت کرو۔ سب ٹھیک ہوگا۔''

اور پھر ماجوری بلز اغوا ہوئی۔ پہلے اُسے چڈی پہنچایا گیا۔ چند دن بعد اُسے سرینگر میں ایک ہاؤس بوٹ میں رکھا گیا۔ ان دنوں غلام وزیر مہدی (ممبر سابق مجلسِ شوریٰ پاکستان) کی ڈیوٹی لگی کہ وہ اسے ارکانِ اسلام سکھائے۔ وہ ہر روز ہاؤس بوٹ میں پہنچتا اُسے قرآن مجید پڑھاتا اور نماز کے بارے میں سمجھاتا۔

ایک دن جب وزیر مہدی اُسے قرآن مجید پڑھارہا تھا اس نے دفعتہً کہا۔

''مارجوری تو جب آپ چلو چلی جائیں گی تو ہم سے کیا پردہ کریں گی؟''

اور اُس نوعمر دوشیزہ نے نہایت متانت سے کہا۔

''اس کا انحصار تو افتخار کی مرضی پر ہوگا۔ اب مارجوری بلز تو رہی نہیں۔ فاطمہ صغریٰ ہے جو شوہر کی مرضی کے بغیر قدم نہیں اُٹھائے گی۔''

پھر نکاح ہوا۔ گواہوں میں سلطان ڈوپٹہ آف کشمیر اور غلام وزیر مہدی تھے۔ اسے سرخ لباس پہنایا گیا۔ سرینگر کے ایک معزز گھر میں طعام وقیام کا بندوبست کیا گیا اور

جب افتخار نے سرخ دوپٹہ ہٹا کر اس کا چہرہ اُوپر اُٹھایا وہاں آنسو چھلکتے تھے۔
”افتخار مجھے ڈر لگتا ہے میری پھوپھی جموں سے آ کر طوفان کھڑا کر دے گی۔
”اوہو۔ سٹوپڈ۔“ افتخار نے اسے بانہوں میں جکڑ لیا۔
”تم کیوں ہلکان ہوتی ہو؟ یہ دردِ سری اب میری ہے کہ مجھے اس بلا سے کیسے نپٹنا ہے؟“
اور پندرہ بیس دن بعد جب مسز ولیم لوٹ کر آئی اور بھتیجی کو غائب پایا تو اس نے آفت مچا دی۔ اسے جیسے پختہ یقین تھا کہ اسے غائب کرنے میں افتخار کے سوا کسی کا ہاتھ نہیں۔
انگریز لڑکی غائب ہو جائے اور طوفان نہ آئے۔ طوفان آیا پر اس طوفان کے آنے سے پہلے ہی افتخار اسے سرینگر سے لے بھاگا۔ جس شام انہیں سرینگر سے روانہ ہونا تھا مارجوری کے ہونٹ نیلے پڑے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں میں وحشت و خوف کے سائے لرزیدہ تھے۔ وہ آزاد ماحول کی پروردہ لڑکی تھی پر افتخار کی محبت اور مسز ولیم کی دبنگ شخصیت نے اُسے بُزدل بنا دیا تھا۔
کہیں یہ بھی سُن لیا تھا کہ میں اسے پاتال سے کھینچ لاؤں گی وہ جاتی کہاں ہے؟
میرے جیتے جی افتخار کے بازوؤں میں سوئے؟ ممکن ہی نہیں!“
پر مسز ولیم اور اس کے حواریوں کے کانوں میں اُس گھوڑے کے سموں کی گرد اڑاتی ہوا کا ایک ننھا سا بگولہ بھی نہ پہنچا جس کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر وہ کارگل کے راستے کھرمنگ پہنچی تھی۔
کھرمنگ میں اسے انثوک کھر محل کے خوب صورت کمرے میں ٹھہرایا گیا۔
مسلسل گھوڑے کے سفر میں اس کی ٹانگیں خون اُتر جانے کے باعث سوج گئی تھیں۔ پر اُسے تو جیسے کسی دُکھ اور مصیبت کی پروا نہیں تھی۔ وہ ہنستی تھی۔ قہقہے لگاتی تھی اور اب اسے شاید یقین ہو گیا تھا کہ وہ محفوظ ہے۔ اس نے محبت کی بازی جیت لی ہے۔ اس نے اپنے محبوب کو حاصل کر لیا ہے۔
وہ بھی کیسے دن تھے۔ میری زیزی (بلتی زبان میں ماں) بتاتی تھیں۔ بڑے راجہ صاحب کو معلوم ہو گیا تھا کہ بیٹا ایک انگریز چھوکری بھگائے لا رہا ہے۔ پر وہ جوانی کے منہ زور گھوڑے پر چند نصائح کی کاٹھی ڈالنے کے خلاف تھے۔ اب جب وہ اسے قبول کر بیٹھا تھا تو بلاوجہ ہنگامہ آرائی کرنے کا فائدہ۔
پر دادی رانی ماں سخت غصے میں تھیں۔ شاہ جہان اپنی جگہ سے اُٹھ کر ایک چھتر کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔ دھوپ نے اس کا چہرہ قندھاری انار کی مانند کر ڈالا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ خاندان کے لیے افتخار کا یہ قدم شرمندگی اور ندامت کا باعث ہے۔ اُس صبح وہ راجہ صاحب سے بھی اُلجھی تھیں کہ انھوں نے افتخار پر سختی نہیں کی۔ بھلا اس ماحول میں ایک انگریز لڑکی کیونکر رہ سکتی ہے۔ بھاگ جائے گی وہ چند

مہینے رہ کر۔ محبت کا سارا جنون صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔“

”دیکھو، محبت انسان کو قربانی دینا سکھاتی ہے۔ اگر اسے افتخار سے سچا پیار ہوگا تو وہ نباہ کرے گی۔“

”خاک کرے گی۔“ دادی رانی ماں جھلا ہیں۔

”غصہ چھوڑو اور استقبال کی تیاریاں کرو۔“ شاہ جہاں نے اس وقت مجھے دیکھا اور کہا۔

”آج میں سوچتی ہوں دادی رانی ماں کی سوچ کتنی غلط تھی؟“

ہاں تو پھر جاروق (محل میں راجہ کے بیٹھنے کی جگہ) میں بیٹھے بیٹھے راجہ صاحب نے اپنے ولی عہد یعنی میرے سسر راجہ فتح علی خاں کو آواز دی۔ جب وہ آئے تو انہیں کہا۔

”جاؤ اپنی زیبزی سے کہو کہ اس کے لیے بلتی لباس تیار کروایا جائے۔ یہ لباس انہیں کھرمنگ پہنچائے جائیں۔ میں چاہتا ہوں وہ ہمارے اپنے لباس میں ہماری سرزمین پر قدم رکھے۔“

پھر بکسوں کی تہوں سے سرسراتے ریشمی کپڑے نکلے۔ ان کی کتر بیونت شروع ہوئی۔ سارا محل راگ ورنگ میں ڈھل گیا۔

مردوں نے محل کے سامنے چھوٹے لان میں تھین کار کی چھ دھنیں بجائیں اور دو دو آدمیوں نے مل کر رقص کیا۔

دونوں ابھی کھرمنگ اپنی پھوپھی فاطمہ کے انثوک کھر میں ہی تھے۔ خپلو آنے کا اذن ابھی نہیں ملا تھا۔ وہ ہر روز پوچھتی۔

”افتخار ہم تمہارے گھر کب جائیں گے؟“

اور وہ بظاہر ہنستے ہوئے کہتا۔

”ارے بھئی چلے جائیں گے۔ کوئی باہر تھوڑی بیٹھے ہیں۔ باپ کا گھر نہ سہی باپ کی بہن کا سہی۔ پر وہ اندر سے کچھ پریشان بھی تھا۔ اُسے تشویش تھی کہ کہیں باپ اور اماں پھڈا نہ ڈال بیٹھیں۔ جس سہ پہر فتح علی خاں نوکروں کے ساتھ پہنچا اور اس نے صورت حال واضح کی۔ تب کہیں جا کر ہمہ وقت ذہن میں کلبلاتے اندیشے ختم ہوئے۔

پھر مارجوری کہ جس کا اسلامی نام صغریٰ فاطمہ تھا نے بلتی لباس پہنا۔ بلتی کن مو (قمیض) جس کے کھلے بازوؤں کو وہ شوق بھری آنکھوں سے بار بار بازو اٹھا کر دیکھتی تھی۔ اس نے گلے میں فلا اور سر پر بلتی ٹوپی جس پر طومار (منقش زیورات) سجے ہوئے تھے پہنے۔ سر پر چادر اوڑھی۔ افتخار اس وقت اس کے پاس موجود تھا۔ جب وہ تیار ہو کر افتخار کی طرف مڑی اور بولی۔

”دیکھو تو میں کیسی لگتی ہوں؟“

اس نے سگار اپنے منہ سے نکالا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کے نازک شانے دبائے اور بولا۔

”تم خپلو کی ملکہ نظر آتی ہو۔“

وہ ہنسی۔ پر اب افتخار نے سنجیدگی کا روپ دھار کر کہا۔

”مارجوری۔“ وہ اسے مارجوری ہی

کہتا تھا۔
"دیکھو میری ماں میرے اس قدم پر سخت ناراض ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس ماحول میں تم نباہ نہیں کر سکو گی اور ایک دن مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔ دیکھو مارجوری میں نے اپنے خاندان کی حسین ترین لڑکیاں روند کر تمھیں پسند کیا۔ تمہیں زندگی کے کسی موڑ پر یہ احساس نہیں دلانا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا یہ فیصلہ کرتے ہوئے اندھے جذبات سے کام لیا تھا۔
مارجوری کا چہرہ پہلے دُھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑا، سکڑا، پھر اس کی آنکھوں میں آنسو اُترے۔
"افتخار تمھاری ماں نے اگر ایسا سوچا تو وہ اپنی سوچ میں حق بجانب ہیں کہ وہ مجھے نہیں جانتیں پر تمھیں تو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ تمھیں میرا اور میرے اندر کے سارے جذبات کا علم ہے۔"
اور وہ اس شدت سے روئی کہ افتخار کو اُسے سنبھالنا دوبھر ہو گیا۔ جب وہ اس کی گیلی آنکھوں کو خشک کر رہا تھا مارجوری نے کہا تھا۔
"افتخار ––– وفا کو تم مشرق کی میراث سمجھتے ہو۔ میں اس پر سے مشرق کی اجارہ داری کو ختم کر دوں گی۔"
پھر وہ پالکی میں بیٹھی اور کھرمنگ سے اس گلیشیر کے راستے چپلو میں آئی۔ جو چھپے کہلاتا ہے۔ سارا چپلو اس وقت پولو گراؤنڈ میں جمع تھا۔ رعایا نے ہاتھوں میں تھالیاں پکڑی ہوئی تھیں جن میں ان کی حیثیت کے مطابق نذرانے تھے۔
اس وقت سینوپا کی دھنیں بجنی شروع ہوئیں۔ سات مردوں کا تلوار کے ساتھ رقص کا آغاز ہوا اور کہاروں نے پالکی پولو گراؤنڈ کے سامنے لا کر رکھ دی۔
پردے اُٹھائے گئے۔ وہ نکلی۔ پولو گراؤنڈ میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس نے رعایا سے تحائف قبول کیے اور اُن کی دعائیں لیں، افتخار اس کے ساتھ تھا۔
پھر وہ محل میں داخل ہوئی۔ سسرالی عزیزوں سے ملی اور جب افتخار کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوئی وہ اس کے قدموں میں جھکی تھی اُس نے اُس کے پاؤں پر اپنے مرمریں ہاتھ رکھے اور گلوگیر آواز میں بولی تھی۔
"افتخار، یہ زندگی تمہارے نام رقم ہوئی۔"
اس وقت میں نے گھڑی دیکھی۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ پینے کے لیے جو پانی ہم بوتل میں ڈال کر لائے تھے اس سے وضو کا ہونا بہت مشکل تھا۔ میں نے شاہجہاں سے پوچھا۔
"کہیں نزدیک پانی ہے؟"
وہ بولی۔
"چلو اس طرف "تھورسے کھر" کی طرف چلتے ہیں۔ ذرا نیچے جہاں ان کی گندم پکی کھڑی تھی۔"
میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"کمبخت اب پھر مجھے اتروائے گی چڑھائے

گی۔ باز آئی میں تیری زمینیں دیکھنے سے۔“
میں نے تیمم کیا۔ نماز پڑھی۔ یہ حقیقت ہے کہ نماز میں ایسی سپردگی اور ایسا جذب کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ جیسا بلتستان، گلگت، ہنزہ اور نگر کی وادیوں میں۔ شاید خدا کے وجود کا ایک بڑا ذرہ ننگا نظر آتا ہے یہاں۔ انسانی کاریگری اور شان کا فقدان ہی اس کے وجود کا بھرپور احساس دلاتا ہے۔ دعا مانگنے کے بعد میں نے کہا۔
”شاہ جہان مارجوری بلز کی زندگی کا یہ ایک پہلو تو ختم ہوا۔ میرے خیال میں زوردار قسم کا عشق کرنا تو کوئی معرکے کی چیز نہیں۔ اصل چیز عشق کے بعد اس تعلق اور ناطے کو نباہنا ہے۔ مارجوری کا یہ پہلو بھی دکھاؤ۔“
شاہ جہان نے بچی کو اٹھا کر چورنگ میں ڈالا۔ اسے کمر پر کسا بولی۔
”اس پہلو کے بارے میں میری ساس بہتر جانتی ہیں ان سے پوچھنا۔“
پھر ہم دھیرے دھیرے نیچے اتر آئیں۔ اترائی میں بہت دشواری محسوس ہوئی تھی۔ لڑھکنے والی کیفیت تھی۔
محل میں آکر میں نے وہ البم دیکھا جو اس کی تصویروں سے بھرا پڑا تھا۔ کہیں وہ اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔ کہیں اپنی ساس اور جیٹھانیوں کے ساتھ ہنس رہی ہے۔ کہیں افتخار کے شانے پر ہاتھ رکھے کھڑی ہے اور پھر میری آنکھوں کے سامنے اس کی وہ تصویر بھی تھی جس میں وہ سفید کفن پہنے سرخ پھولوں سے لدی پھندی خاک ہونے جا رہی تھی۔
میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں مجھے اپنے چاروں طرف اس پھول کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے صفحہ پلٹ دیا تھا۔ ایک اور تصویر ہنستی مسکراتی سبز آنکھوں سے محبت اور خلوص کی بارش کرتی ہوئی سامنے آ گئی تھی۔
رات کو مہارانی سے باتیں ہوئیں۔ میں نے وہی سوال کیا تھا جس کے بارے میں شاہ جہان نے کہا تھا۔
”میری ساس اس پہلو پر زیادہ بہتر بات کر سکتی ہیں۔“
پر ہوا یہ کہ مہارانی نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔
”بولو اگر تمہیں کسی سے عشق ہو جائے اور اس کے ساتھ کسی ایسے ماحول میں رہنا پڑے تو بتاؤ رہ سکو گی؟“
میں ٹپٹا اٹھی تھی۔ پر چند لمحے سوچنے اور اپنے آپ میں ڈوبنے کے بعد میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔
”میرا خیال ہے نہیں۔ یقیناً میں اتنی ایثار پسند ہو ہی نہیں سکتی۔“
”میری بچی، جو چلو تمہیں آج نظر آتا ہے اُس چلو سے بہت مختلف ہے جب ماجوری یہاں آئی تھی۔ تب بجلی نہیں تھی، ہسپتال نہیں تھے، سڑکیں نہیں تھیں، لوگ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ جاگیرداری روایات میں پلا ہوا گھرانا

تھا جس کی عورتیں محلاتی سازشوں کا شکار تھیں۔ توڑ جوڑ جن کی فطرت تھی۔ وہ بہت غمگسار اور شفیق عورت تھی۔ اُسے چلو آئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا جب گھر کی ایک ملازمہ نے اس کے اُس سویٹر کی بہت تعریف کی جو وہ پہنے ہوئے تھے اس نے اشارے سے پوچھا۔

''لوگی؟'' ملازمہ نے اشارہ سمجھا اور سر اثبات میں ہلا دیا۔ اس نے سویٹر اتارا اور اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

اس واقعے کو بڑی مہارانی کے کانوں تک پہنچنے میں اتنی ہی دیر لگی تھی جتنی اسے اپنے کمرے میں پہنچنے میں۔ بڑی مہارانی آگ بگولہ تھی۔ فی الفور اسے طلب کیا۔ افتخار کے سامنے اسے وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ بیچاری ہونقوں کی طرح ان کی صورت دیکھتی رہی۔ پھر جب کمرے میں آئی تو افتخار نے پوچھا۔

''تم نے نوکرانی کو سویٹر کیوں دیا تھا؟''

اور وہ حیرت زدہ سی بولی۔

''اس نے مانگا تھا۔ افتخار بھلا کیسے نہ دیتی؟''

''کل کوئی تم سے مجھے بھی مانگ سکتا ہے۔ دے دوگی مجھے؟''

''تمہیں کیوں؟ کون مانگے گا تمہیں مجھ سے؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''میری زیزی جو اُدھار کھائے بیٹھی ہے۔'' افتخار نے تلخی سے کہا۔

''مارجوری یاد رکھو یہاں رہنا ہے تو ہونٹوں کو سی لو اور کانوں کو کھول لو۔''

اور اُس نے ہونٹوں کو سی لیا تھا اور کانوں کو کھول لیا تھا اور ساری زندگی اسی انداز میں اس گھر میں گزار دی تھی۔

''کیا کوئی لڑکی ایسا کر سکتی ہے؟ ارے خود ہماری بہو بیٹیاں ایسی نہیں۔''

میں مہارانی کی بات کا کیا جواب دیتی کہ خود مجھے اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت تھی۔

☆☆☆☆☆

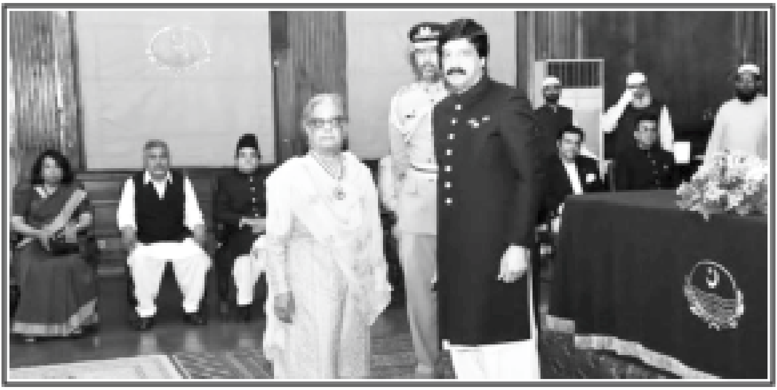

محترمہ سلمیٰ اعوان گورنر پنجاب جناب سلیم حیدر سے تمغۂ امتیاز وصول کرتے ہوئے۔

وہ زود رنج

''میں مرنے سے پہلے تمہیں ضرور بتاؤں گا یار۔ تمہیں بتائے بغیر مجھے موت آئے گی ہی نہیں۔'' وہ اکثر یہی کہتا تھا پھر سگریٹ سلگا کر بیٹھ جاتا دھواں اڑاتا رہتا سگریٹ ختم ہونے والی ہوتی تو پھر سلگا لیتا۔ لکھتا رہتا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا اور کڑوی کسیلی سی مسکراہٹ مجھ پہ پھینکتا رہتا۔ عین اس وقت جب میں اسے گھور رہا ہوتا۔

''دل گردے ختم ہو جائیں گے'' میں اسے اور شدت سے گھور کے کہتا تو وہ کام چھوڑ کے ہاتھ جوڑ دیتا۔

''مجبور ہوں یار دل کے ہاتھوں مجبور ہوں کچھ بھی بس میں نہیں ہے گندی سہی لیکن عادتیں پڑ گئی ہیں۔ چھوڑ دوں گا''

''کب؟''

''جب مر جاؤں گا'' وہ خباثت سے کہتا پھر کام کرنے لگتا۔

''تمہیں کوئی دکھ نہیں ہے کیفیت بنالی ہے تم نے صرف خود ترسی کا شکار ہو'' میں جھلا کر کہتا:

''یار کا سینہ تو چیر کے دیکھ دکھوں سے چھلنی ہے'' وہ جذباتی ہو کے اٹھتا پاؤں سے ہر چیز کو پرے دھکیلتا بھری بھری آنکھوں سے مجھے دیکھتا اور نکل جاتا۔ ساری رات سڑکوں پہ پھرتا بہت پیتا پی پی کے نڈھال ہو جاتا تو لوٹ آتا اکثر اذان فجر ہو رہی ہوتی۔ جوتوں سمیت ڈھے جاتا۔ مجھے پچھتاوے گھیر لیتے کہ کیوں کہتا ہوں یہ سب اسے مزید دکھی کر دیتا ہوں اسے بیہوش پڑے دیکھتا رہتا، سیدھا کرتا اس کے جوتے اتارتا۔ یہ سب پچھلے کئی سالوں سے ہو رہا تھا مگر اب اس کی برداشت کم ہوتی جا رہی تھی سمجھتا یا سدھرتا نہیں تھا بس الجھ پڑتا۔

میں زوار احمد بالکل نہیں جانتا کون ہوں یتیم خانے میں پلا بڑھا کچھ بھی یاد نہیں کہاں

ثمینہ سیدؔ

سے آیا کوئی اپنا یا شناسا چہرہ ذہن کی سکرین پہ کبھی ابھرا ہی نہیں۔ لیکن یہاں بہت سے اچھے لوگ تھے جیسے اپنے ہوتے ہوں گے ویسے ہی اچھے۔ ہم کئی لڑکے خوب پڑھ لکھ کے بہت سی ذمہ داریاں سنبھالنے لگے۔ انھی دنوں مجھے بنک کی بہت اچھی نوکری مل گئی تو میں نے ادارے کے سرپرست امجد علی بابا سے درخواست کی کہ میں الگ رہنا چاہتا ہوں آزاد اور خود مختار زندگی گزارنا چاہتا ہوں انھوں نے میرا ماتھا چوما اور ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ مجھے زندگی کی طرف جانے والے راستے پہ ڈال دیا۔ میں نے ایک فلیٹ کرائے پہ لیا ضرورت کی ہر چیز لا کے رکھی ٹیرس پہ چائے کا کپ پکڑ کے کھڑا ہوتا تو ممنون نظروں سے آسمان کو دیکھتا نہ تھکتا۔ انھی دنوں حبیب سے ملاقات ہوئی۔ میرے والے بنک میں اس کو نوکری ملی تھی باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ ہاسٹل میں رہتا ہے میں نے کہا میرے پاس آجاؤ۔ تو فوراً مان گیا۔ عجیب زودرنج تھا اپنوں کا ڈسا ہوا میں اپنوں کو ترستا اور وہ اپنوں کو کوستا رہتا۔ لمبا چوڑا وجیہہ نوجوان تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد ماں نے شادی کر لی زمینوں جائیدادوں والا تھا لیکن چچا تایوں نے قبضہ کر رکھا تھا وہ گھر سے نکل آیا رلتا رلاتا نوکری کرتا سگریٹ پیتا اور شکوؤں سے بھرا سلگتا رہتا۔ میں سمجھانے کی کوشش کرتا تو صاف کہتا ”یار چلا جاؤں گا۔ تم شادی کر لو پھر نکل جاؤں گا“

میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ لیکن اب سمجھ میں آیا زندگی اتنی سیدھی اور آسان ہرگز نہیں ہے ایک دو دوستوں نے اپنی ماں اور بیویوں کے ذریعے کوشش کی تو لوگوں نے مجھے پورا پورا ادھیڑ ڈالا کون ہوں؟ کہاں سے ہوں؟ باپ ماں حسب نسب اپنا گھر ہے یا نہیں؟ گھر بھی خرید لیا لیکن مکیں وہی میں اور میرا یار حبیب۔ جب کسی کو پتا چلتا کہ یتیم خانے میں پلا بڑھا ہوں تو سوالات اور نوکیلے ہو جاتے کہ جائز بھی ہوں کہ نہیں۔ زندگی سوال بن کر رہ گئی تھی۔

”حبیب تم شمع سے محبت کرتے ہو؟“ میں نے حبیب کو چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے پوچھا آج ذرا اچھے موڈ میں تھا نئی نوکری ملی تھی اسے کچھ دن پہلے کسی اخبار کے دفتر میں۔

”ہاں کافی زیادہ - کیوں چھوڑ دوں؟ تم سے زیادہ محبت نہیں کرتا میں کسی سے“ وہ حسب عادت خباثت سے بولا:

”نہیں یار چھوڑنا کیوں میں سوچتا ہوں تم بے وجہ مضطرب رہتے ہو اگر محبت ہو گئی ہے تو شمع سے شادی کر لو ختم کرو یہ بے سرو سامانی“۔ وہ چپ رہا تو میں موقع غنیمت جان کے پھر بولا:

”شاید خوشیاں منتظر ہوں“ وہ ہنسنے لگا زور زور سے ہنستے ہنستے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''اور ایسا نہ ہوا تو تیرا یار مر جائے گا یاد رکھنا'' سرخ آنکھوں سے مجھے دھمکایا۔
''شاید وہ منتظر ہو کہ تم کہو تو وہ گھر میں بات کرے۔''
''اس نے کبھی کہا ہی نہیں ابھی اس لمحے سے پہلے میں نے بھی نہیں سوچا تھا۔۔ہاں یہ ضرور کہتی ہے ان کے خاندان میں ذات پات سے خاندان سے باہر شادیاں نہیں ہوتیں۔''
''پھر تم سے ملتی کیوں ہے؟''
''محبت کرتی ہے، بہت خیال رکھتی ہے لیکن دیکھ یار وہ بھی جھوٹی ہے خوب ملتی ہے مگر شادی۔۔۔ شادیاں خاندان میں ہوتی ہیں۔۔ یہ کیسی بات ہے۔ یہی کہا تھا اس نے۔ میں انتہاؤں سے گر پڑتا ہوں کہ پھر مجھ سے ملتی کیوں ہے اگر۔۔۔'' وہ بے حد آزردہ ہوا تو میں قریب چلا آیا اس کے سرد پڑتے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے ''بدگمانی اچھی نہیں بات تو کرو فیصلہ کن۔''
''ہاں کروں گا لیکن۔۔ اگر نہ مانی تو محبت کیسی پھر میں تو لٹ گیا ناں۔۔۔'' وہ پاگل سا لگنے لگا میں نے بات بدلی
مگر وہ اٹک سا گیا تھا۔ دن معمول کے مطابق گزرنے لگے لیکن نیا یہ ہوا کہ مجھے بھی محبت ہوگئی میرے دفتر میں ایک معصوم سی لڑکی آئی تھی میرے یار حبیب جیسی دکھی سی پہلی کشش یہی تھی پھر بات چیت ہوئی کچھ اعتماد بنا تو اس نے بتایا وہ بہت چھوٹی تھی جب اس کے ابا نے اس کی امی کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا تھا بہت مشکلات میں ہم ماں بیٹیوں نے زندگی گزاری ہے تو میں نے بھی ہمت کر کے سب کہہ ڈالا جو میں ہوں اور جو میں نہیں ہوں۔
''تو کیا ہوا زوار احمد یہاں خاندانی مرد کونسے حسبی نسبی ہوتے ہیں قدروں سے بھرے ہوتے ہیں میرے بابا نے رات کے اندھیرے میں ہم ماں بیٹیوں کو حویلی سے نکالا تھا کبھی پلٹ کے خبر نہیں لی۔''
''تو کیا تمھیں میرے وجود کے جائز یا ناجائز ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟ میں حیرت زدہ تھا اور دل۔۔ اس کی کیفیت تو ناگفتہ بہ ہے یار''
''تم شاید دل لگی کرنا چاہتے ہو ورنہ میں تو یہ کہنے والی تھی کہ خوشیوں کا استقبال بھرپور طریقے سے کرنا۔ مجھے ویلکم کہنے کے لیے خوب گھر سجانا کوئی کنجوسی نہیں چلے گی بولو کیا کہتے ہو۔'' وہ مشکوک نظروں سے مجھے دیکھ کے ڈپٹ کے بولی تو میں نے اس کے ہاتھ پکڑ کے بے اختیار چوم لیے۔
''میرے گھر اور دل کے دروازے کھلے ہیں سارا تم نے مجھے پہلی بار احساس دلایا کہ میں ہوں میرا وجود قیمتی ہے میرے ہونے کے کچھ معنی ہیں'' میں جذباتی ہونے لگا وہ ہاتھ چھڑا کے بولی ''زیادہ مکالمہ بازی نہیں اوکے'' اور چلی گئی میں خوش تھا بہت خوش۔

میں آج گھر آیا تو مجھے لگا یہ سارا کا گھر ہے وہ ہر جگہ ہے اونچی آواز سے بولتی مجھ پہ رعب جھاڑتی میرے اردگرد ہے دیر تک میں اسی خیال کی مستی میں رہا۔ آنکھیں بند کر کے لیٹا ہی تھا کہ آنکھوں میں میرا زود رنج سا یار اتر آیا" کیسے کہوں گا حبیب سے کہ اپنا ٹھکانا کر لے یہ گھر سارا کا ہو گیا ہے میرا نہیں رہا۔ میں سر پکڑ کے بیٹھ گیا جانے کتنا وقت بیت گیا میرے اعصاب سن ہونے لگے فقرے بنتے جڑتے پھر ٹوٹ جاتے۔ فجر کی اذان سماعتوں سے ٹکرائی تو میں چونکا۔

"حبیب کہاں ہے؟"

"وہ آیا نہیں؟ پوری رات گزر گئی"

"کاش وہ شمع کو منا لیتا تو زندگی کس قدر آسودہ ہو جاتی" میں خود کلامیاں کرتا اٹھ کے کچن تک آیا کچھ کھانے کو ڈھونڈنے لگا" حبیب نے کچھ کھایا ہوگا کہ نہیں" مجھے فکر ہوئی۔

"زوار میں شمع سے بے حد محبت کرتا ہوں اسے کھونے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں وہ لوگ غیر ذات میں شادی نہیں کرتے یار وہ نہ مانی تو تیرا یار جی نہیں سکے گا" حبیب نے کہا تھا۔۔ بلکہ وہ اکثر یہی کہتا۔

میرے دل کو ہاتھ سا پڑا میں بھاگ کے بیڈ روم میں آیا موبائل بھی نہیں مل رہا تھا میری چھٹی حس مجھے پریشان کرنے لگی۔ موبائل مل گیا تو ہاتھ کانپنے لگے نمبر نہیں مل رہا تھا پھر مل گیا۔۔ تو بجتا رہا میں پاگلوں کی طرح بار بار کال کرتا رہا۔ کوئی اٹھا کیوں نہیں رہا۔ پھر شمع کا نمبر ڈائل کیا بج رہا تھا میں کانٹوں پہ لوٹتا رہا۔۔۔

ہیلو سنتے ہی میں نے کہا "میں زوار" وہ زار و قطار رو رہی تھی "زوار بھائی حبیب بہت جذباتی تھا میں نے بہت کوشش کی کہ کہ اسے سمجھا سکوں لیکن نجانے کیوں وہ زود رنج سا رہتا تھا۔"

"تھا" کے لفظ نے میرا سینہ چھلنی کر دیا میں مفلوج سماعتوں سے ہسپتال کا نام بمشکل سن سکا اور نجانے کیسے پہنچا کیسے اپنے بھائی کا وارث بنا کیسے کارروائیاں پوری کیں سب کہہ رہے تھے اس نے خودکشی کر لی میرا یار اور کیا کرتا۔

شمع جو اس کے ساتھ ہر وقت ہنستی رہتی تھی اسے سمجھا رہی تھی کہ اس کے گھر والوں نے اس کی شادی طے کر دی ہے اور وہ مجبور ہے۔

"کوئی محبت کرتے ہوئے...... تعلقات چلاتے ہوئے مجبور نہیں ہوتا یہ مرد و زن شادی کی چاہ میں مجبور کیسے ہو جاتے ہیں ان کے بدن میں محبوب کی خوشبو کیوں نہیں رہتی یہ کسی اور کے ساتھ کیسے رہنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔"

میں شمع پہ چلاتا رہا۔۔ پھر اسے قبر میں اتار آیا اپنے زود رنج یار کو جو سچا تھا اور وفادار بھی۔۔

☆☆☆☆☆

خُود رُو پھول

ڈھاکہ پہنچتے ہی اُس لڑکی میں ایک تبدیلی آئی کہ وہ کسی کو بھی اپنی پہچان نہیں کرائے گی۔ اگر پُوچھا گیا تو وہ اپنے بجائے اپنی ماں کا نام بتائے گی۔ اُس نے خُود کو اس طرح رضامند کر لیا کہ اس طرح وہ ہر مرد کی غیر ضروری توجہ سے محفوظ رہ سکتی تھی۔ وہ اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں لگا سکتی تھی کہ اس یقین نے اس کے اندر کب جڑ پکڑی تھی؟۔ وہ اتنی پڑھی لکھی نہیں تھی کہ اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کو کوئی رُوپ دے سکتی۔ یہ خیال اُسے اُس وقت عود کر آیا جب وہ بس کے لمبے سفر کے دوران اُونگھ رہی تھی اور ساتھ بیٹھے مسافر نے بہت رازداری کے ساتھ اُس کی ساڑھی کے نیچے اس کی چھاتی کو چُھوا تھا۔ اُسے یہ خیال بہت بھلا اور دل موہ لینے والا لگا۔ وہ پُراعتماد تھی کہ وہ ڈھاکہ میں اپنا کوئی نہ کوئی ٹھکانہ ڈھونڈ لے گی۔ تاہم وہ یہ بیان کرنے سے قاصر تھی کہ اُس نے ایسا کیوں سوچا تھا؟

گبتالی بس اڈے پر اُترنے کے بعد، لڑکی کو بہت بھوک محسوس ہوئی۔ اُس نے ڈیڑھ دن سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ اپنی بھوک مٹانے کے لیے بھلا ایک انسان کتنا پانی پی سکتا ہے! اُس کے پاس سو روپے کا ایک نوٹ تھا جو اُس کے پیٹی کوٹ کے کمربند میں اڑوسا ہوا تھا۔ پیٹی کوٹ کی ڈوری کے ایک ڈھیلے پن سے وہ نوٹ اُڑ جانا تھا۔۔۔ وہ اپنا جسم کھو جانے سے زیادہ نوٹ کھو جانے سے خوفزدہ تھی۔ وہ اس خیال کے ساتھ شہر آئی تھی کہ یہاں رقم کی بہت قیمت تھی جبکہ اُس کی جان کی اتنی قیمت نہ تھی۔ لڑکی نے اپنے اردگرد مردوں کو دیکھا۔ اپنے بہت اندر، وہ ان سب سے یکسر بہت متنفر تھی۔ وہ اُسے چکناہٹ سے بھرے ہوئے لگے، جن کے بھدے جسموں سے عجیب سی بدبو آتی تھی اور وہ اس کے ساتھ وہ بہت غلیظ بھی تھے۔ اُس نے ذہنی دباؤ اور نفرت کے ساتھ اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دوبارہ کھول لیں۔

شام کو بس جلدی ہی آ گئی۔ اُس کے بعد کافی حد تک، رش میں کمی آ گئی تھی۔ لڑکی اب خُود

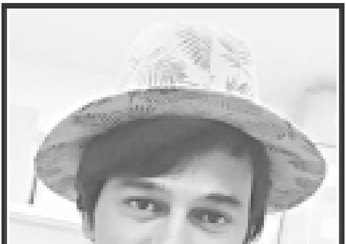

سلینہ حسین
مترجم: حمزہ حسن شیخ

کو آرام وہ محسوس کر رہی تھی۔ ایک بار، اکثر لوگوں کے چلے جانے کے بعد، وہ مکمل طور پر اس بس اڈے کی مالک بن جائے گی۔ یقیناً ان میں کچھ بسیں اور ٹرک یہیں پہ ہی رہیں گے۔ پھر اُسے کسی کا خوف نہیں رہے گا۔ وہ قریبی درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر آرام کرنا چاہتی تھی لیکن اُسے ڈر تھا کہ وہ ڈگمگا جائے گی۔ جونہی وہ بیٹھی، ایک آوارہ دو نسلا کتا اُس کے پاس آ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اُس نے پیار سے اپنا ہاتھ کتے کی پیٹھ پر رکھا اور جواب میں کتا دوستی کے لیے اُس کا بازو چاٹنے لگا۔ اُس کا رال منہ سے ٹپکا اور بازو گیلا ہو جانا لڑکی کو اچھا نہ لگا اور اُسے اس ننھے حیوان پر غصہ آ گیا۔

"تم نے مجھ سے پُوچھے بغیر، میرا ہاتھ کیوں چاٹا؟ تم کیا سمجھتے ہو کہ تم چیئرمین کے بیٹے بجلو ہو؟ تم کچھ بھی نہیں لیکن ایک گندے کتے کے بچے ہو۔۔۔ جاؤ۔۔۔ دفع ہو جاؤ۔۔۔"

قریب کھڑا ایک لڑکا، آم کی گٹھلی چوس رہا تھا۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ "تم اس کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کیوں کر رہی ہو؟"

"ایک بندے اور ایک کتے میں کیا فرق ہوتا ہے؟" اُس نے کہا ۔ لڑکے نے آم کی گٹھلی کو دور پھینکا۔ "کیا تمہارے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟"

"ہاں، ہے۔۔۔ کیوں؟ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں فقیر ہوں۔۔؟"

"تو پھر گھر جاؤ۔۔۔" اُس لڑکے نے کہا۔

"نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

"تو پھر تم کہاں رہو گی؟" لڑکے نے پُوچھا۔

"اسی گلی میں۔"

"گلی رہنے کے لیے اچھی جگہ نہیں۔" "دفع ہو جاؤ۔ میں وہی کروں گی جو میرا جی چاہے گا۔"

"کیا تمہیں بھوک نہیں لگی؟"

"ہاں۔ میں بھوک سے مر رہی ہوں۔"

"آؤ اُس ریسٹورنٹ میں چلیں۔ اُس کا مالک تمہیں کچھ چاول دے دے گا۔"

"مالک کیوں مجھے چاول دے گا؟ کیا اُس نے مجھے کچھ دینا ہے؟"

"نہیں۔ اُس نے کچھ نہیں دینا، لیکن تمہیں پتہ ہے کہ وہ ایک رحمدل انسان ہے جو غریبوں کو کھانا کھلاتا ہے۔ آؤ چلیں۔"

لڑکی کچھ دیر تک بدگمان سی رہی۔ اُسے اپنے اندر کچھ نامعلوم خوفناک سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے غصے میں اپنے باپ کو چھوڑ دیا تھا اور ایک ہی لمحے کے فیصلے میں، وہ ڈھاکہ جانے والی بس میں سوار ہو گئی تھی۔ اب، وہ حیران ہو رہی تھی کہ اس انجان شہر میں وہ کہاں کا رُخ کرے گی! لڑکا ابھی تک اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ گہرے سیاہ رنگ اور ہڈیوں کے ڈھانچے میں، وہ لڑکا کسی بندر کے مشابہ تھا، لڑکی نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ ہاں، درحقیقت وہ ایک بندر ہی تھا۔ آج، وہ چھوٹا تھا لیکن جلد وہ بڑا ہو جائے گا۔ سر درد کی ایک تیز ٹیس نے اُس کو پکڑ لیا اور اُس کو کمزوری محسوس ہوئی۔ تیز چلاتی ہوئی آواز

میں، وہ لڑکے سے مخاطب ہوئی، ”تم کیوں ابھی تک یہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟“

”صرف تمہارے لیے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے ورنہ اب تک تم وہاں جا چکی ہوتی۔“

”کیا نام ہے تمہارا؟ تم چھوٹے شیطان؟“

”جلفو، جلفو علی۔“

”تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“

”کیا تمہاری ماں نہیں ہے؟“

”میری ماں مر گئی ہے۔ میں نے اُسے کبھی بھی نہیں دیکھا۔“

”او اچھا۔۔۔“

”کیا اچھا؟“

”کہ تم چوہڑے ہو۔۔۔“

جلفو علی کھلکھلا کے ہنسنے لگا۔ اُس کو لطف آیا۔ اس میں کوئی حیرت نہیں تھی کہ وہ اس طرح کے طنزیہ مذاق کئی بار سُن چکا تھا۔ لوگ ایسے الفاظ اُن بچوں کے لیے بھی استعمال کرتے تھے جن کے باقاعدہ پیدائش کے ریکارڈ موجود تھے۔ گلیوں کے یہ بچے اپنی عمر سے کہیں زیادہ سیانے تھے۔ جلفو اکڑ کے لڑکی کے سامنے آ گیا اور پُوچھا،

”آنٹی، آپ کا نام کیا ہے؟“

”گوری گاؤں۔۔۔“

”یہ کیسا نام ہے؟“

”چپ ہو جاؤ، بندر۔۔۔“

لڑکا ایک بار پھر کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ ایک بوڑھی بھکارن اُن کی جانب آئی، ”یہ عورت کا بھوت کس کا ہے؟“ لڑکی نے اُس کو دیکھنے کی کوشش کی: بالکل خشک، رُوکھے اور اُلجھے ہوئے بال، گھٹنے کی لمبائی تک گندی ساڑھی، جس کا دھڑ کو چھپانے کے لیے کوئی بلاوز اور پیٹی کوٹ نہیں تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ٹین کی ایک خالی پلیٹ تھی۔ اُس کی کمر میں کچھ اُڑسا ہوا تھا، شاید پان یا پھر رقم۔ اُس کا بغیر دانتوں کے منہ سامنے کی جانب سے بہت بھدا تھا۔ اُس کے چہرے کی جلد کی مختلف تہوں نے سڑک کی ساری دُھول جمع کر رکھی تھی۔ لڑکی اُس کا دیکھ کر پریشان سی ہو گئی اور آہستگی سے خُود کلام ہوئی، ”میں نے ایسی چڑیل پہلے کبھی نہیں دیکھی۔“ بوڑھی عورت اُس کے قریب بیٹھ گئی اور پُوچھا،

”کیا تم آج کچھ نہیں کما سکی؟“

”نہیں، میں بھیک نہیں مانگتی۔“

”آہ۔۔“ بوڑھی عورت نے لڑکی پر بُرا سا منہ بنایا، ”اے لڑکی، نام کیا ہے تیرا؟“

”گوری گاؤں،“ اُس نے فوراً جواب دیا۔

”گوری گاؤں تو تمہارے گاؤں کا نام ہے۔ تم اپنا نام بتاؤ؟“

”گوری گاؤں۔“

”یہ کیسا نام ہے؟“

”کیا مسئلہ ہے؟ کوئی نام وہی کام کر سکتا ہے جب تک آپ مجھے اُس نام سے بُلاتے رہیں اور میں جواب دیتی رہوں۔۔۔ نام کا مقصد پُورا ہوتا رہتا ہے۔ اس نام والے

سارے ڈرامے کا مقصد ہی کیا ہے؟''

بوڑھی عورت اُس کے اس خیال پر کھِلکھلا اُٹھی۔ اُس کے خشک اور کھُردرے بال ہوا میں لہرائے، کچھ اُس کے چہرے پہ آ گئے جنھوں نے اُسے مزید بھیانک بنا دیا۔ اُس کے ہنستے ہوئے چہرے نے لڑکی کو وہ چڑیلیں یاد دلا دیں جن کے بارے میں اُس نے اپنے بچپن میں سُنا تھا۔ ''تم کیوں ہنس رہی ہو؟ ہنسنا بند کرو۔'' وہ زور سے چلائی۔

بوڑھی عورت اچانک ہی خاموش ہو گئی۔ آنکھیں پھیلاتے ہوئے، اُس نے کہا، ''ارے لڑکی، میں نے تمہارے لیے نام ڈھونڈ لیا ہے: میں تمھیں ''شہزادی'' کہوں گی۔'' جلفو نے اُچھلنا شروع کر دیا، ''ہم نے ڈھونڈ لیا! ہم نے ڈھونڈ لیا! ہم نے تمہارے لیے نام ڈھونڈ لیا۔'' لڑکی نے محسوس کیا کہ وہ واقعی بندر جیسی حرکات کر کے بندر ہی لگ رہا تھا۔ شاید وہ بندروں کے کسی گروہ میں پیدا ہوا تھا۔

لڑکے نے تیوری چڑھائی، ''تم کیوں مجھ پہ ناک بھوں چڑھا رہی ہو؟ آؤ! ہم سب اُس ہوٹل پہ چلیں۔ تم نے ابھی کہا نہیں کہ تمھیں بہت بھوک لگی ہے، شہزادی آنٹی؟''

''چپ کرو--- ننھے شیطان---!''

''لیکن کیا آپ بھوکی نہیں ہو؟''

لیکن اس سے پہلے کہ لڑکی کوئی جواب دیتی، بوڑھی عورت نے جلفو کا ہاتھ پکڑ لیا، ''میں بھی بہت بھوکی ہوں۔ کیا تم مجھے کچھ چاول لے کے دے سکتے ہو؟''

''نہیں، نہیں، میں تمھیں نہیں کھلا سکتا۔ اگر مالک نے تمھیں دیکھ لیا تو وہ بہت غصہ کرے گا۔''

''لیکن تم نے ابھی نہیں کہا کہ تمہارا مالک بہت رحمدل ہے،'' بوڑھی عورت نے اُسے جواب دیا۔

لڑکی نے تیز نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ جلفو سے کوئی جواب نہیں بن پا رہا تھا۔ وہ کچھ ناقابلِ سماعت سے الفاظ بڑبڑایا اور پیشاب کرنے کے لیے تھوڑی دور چلا گیا۔ بوڑھی عورت نے جب کوئی بات بنتی نہ دیکھی تو جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''شہزادی، اس دُنیا میں مہربانی کی بہت سی اقسام ہیں؛ ایک قسم کی مہربانی تمہارے لیے ہے جبکہ میرے لیے کوئی اور قسم ہے۔'' وہ دوبارہ دل کھول کے ہنسنے لگی اور اُسکا لُعاب ہر طرف گرنے لگا۔ لڑکی نے ایک نظر اُس کے بدصورت چہرے پہ ڈالی؛

''تم بالکل ایک چڑیل لگتی ہو۔'' بوڑھی عورت نے چونکتے ہوئے جواب دیا،

''تم یہ کیوں کہتی ہو؟ اگر تم شہزادی ہو تو میں شہزادی کی دادی ہوں۔''

''ہش---! دادی---! جاؤ اب---!''

بوڑھی عورت کے جانے کے بعد، جلفو آیا اور لڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔

''آؤ چلیں--- شہزادی آنٹی'' اُس نے لاڈ کرتے ہوئے کہا۔

’’تمہارے مالک کا نام کیا ہے؟‘‘
’’توفہ علی۔ تمام لوگ اُسے توفہ بابو کہتے ہیں۔‘‘
’’کتنی شادیاں ہیں اُس کی ۔۔۔؟‘‘ جلفو ہنسا۔ اُس کی ہنسی کے انداز نے بتا دیا جیسے اس جواب میں کئی کہانیاں پوشیدہ تھیں۔ لڑکی کو یہ اچھا نہ لگا۔
’’اچھا، تو اُس نے کبھی بھی شادی نہیں کی؟ کیا یہی بات ہے؟‘‘ لڑکی نے اُس سے جواب نکلوانے کے لیے پوچھا۔
’’کیوں نہیں کی؟ کیا ایک مرد شادی کے بغیر رہ سکتا ہے؟‘‘
’’تمہیں کیسے پتہ ہے کہ وہ نہیں رہ سکتا؟‘‘
’’مجھے سب پتہ ہے۔ میرے مالک نے پانچ شادیاں کی ہیں۔ پہلی بیوی بچہ جنتے ہوئے مر گئی تھی، چھوٹی نوزائیدہ بچی بھی مر گئی تھی۔ دوسری کسی اور مرد کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اُس کے بعد آنے والی بیوی کو مالک نے خود ہی طلاق دے دی تھی۔ تو، میں نے کتنی گنوادی ہیں؟‘‘
’’صرف تین ۔۔۔‘‘ لڑکی نے دلچسپی سے جواب دیا۔
’’جہاں تک چوتھی بیوی کا تعلق ہے تو اُسے چیئرمین کا بیٹا پٹ سن کے کھیت میں لے گیا ۔۔۔۔۔‘‘
’’رُکو! تمہیں اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ۔۔۔‘‘
’’یقینی طور پر، مالک کو اُسے طلاق دینی پڑی! اب حال ہی میں، اُس کی اپنی پانچویں بیوی سے شادی ہوئی ہے۔ اُن کا کوئی بچہ نہیں ہے۔ قدرتی طور پر مالک اس بارے میں بہت اُداس ہے۔‘‘
’’اُداس! اُس نے ابھی تک کچھ بھی نہیں دیکھا!‘‘ لڑکی نے آہ بھری۔ وہ اس عجیب و غریب انسان سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ اُٹھی اور اپنی ٹانگیں اور بازو سیدھے کیے، اپنا پاؤں سیدھا کیا اور زور زور سے ہلایا جو کہ شل ہو چکا تھا۔ جلفو نے محسوس کر لیا کہ بالآخر وہ اُس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ اُس نے اپنا بازو اُس کی جانب بڑھایا اور کہا،
’’آؤ چلیں۔‘‘
’’ہاں، آؤ چلیں۔‘‘ آخر کار لڑکی بے نیازی کے ساتھ اُٹھی اور خود کو سنبھلتے ہوئے جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اگر وہ ابھی کچھ بھی نہ کھاتی تو رات کو کھڑے ہونے کے قابل نہ رہتی۔ اُنہوں نے گلی پار کی اور توفہ علی ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔ وہاں پہ زیادہ لوگ نہ تھے، صرف دو آدمی کھانا کھا رہے تھے۔ جلفو نے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر لڑکی کی آمد کی اطلاع دی۔
’’مالک، میں اسے لے آیا ہوں،‘‘ اُس نے اونچی آواز میں کہا۔
’’آؤ آؤ نئی۔‘‘
’’مالک، میں اسے لے آیا ہوں،‘‘ جلفو نے دوبارہ وہی الفاظ اگلی رات بھی دوہرائے

تھے۔ لڑکی کے لیے دوبارہ وہی الفاظ سننا بہت تکلیف دہ عمل تھا۔ اُس نے محسوس کیا جیسے گرم تپتا ہوا لوہے کا راڈ اُس کے کانوں میں ڈال دیا گیا ہو۔ اُس کو معلوم نہ تھا کہ اس راڈ کی لمبائی کتنی تھی یا یہ داخل ہونے میں کتنا وقت لے گا۔ توفہ بابو اپنے چہرے پہ کھسیانی اور دانتوں کی نمائش کرتی ہنسی لیے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی موتیوں کی طرح کالی آنکھوں پہ دو کالی بہت ہی گھنی آبرو لٹک رہی تھیں اور ایک موٹا اور بڑا سا ناک اُس کے چہرے پہ قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ سامنے سے اُس کے بالوں کا اچھا خاصا حصہ اُڑ گیا تھا۔ اُس کا موٹا جھولتا ہوا پیٹ، اُسے حاملہ گائے کی یاد دلاتا تھا۔ لڑکی یہ منظر زیادہ دیر نہ دیکھ سکی۔ اُس نے دوسرے دو کھانا کھاتے مردوں کو دیکھنے کے لیے نظریں دوسری جانب موڑ دیں۔ جلفو نے اُس کا تعارف کرانا شروع کر دیا،

''مالک، اس کا نام شہزادی ہے، بوڑھی بھکارن نے اسے یہ نام دیا۔''

یہ سُن کر، دونوں آدمی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے اور کھانے کے ذرات اُن کے منہ سے باہر اُچھل پڑے۔ توفہ بابو بھی ہنس رہا تھا۔ وہ اشارے سے اُسے بُلا کر اندر لے گیا،

''آؤ اور بیٹھ جاؤ، شہزادی۔''

''میرا نام گری گاؤں ہے۔۔۔'' لڑکی نے کہا۔

''مجھے سمجھ آ گئی۔ آپ عورت نہیں ہو۔ آپ ایک گاؤں ہو۔ آؤ، آؤ۔۔۔ کیا تم بھوکی نہیں ہو؟''

''ہاں، میں نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔''

''ارے جلفو، اسے چاول اور گوشت کی دو پلیٹیں لا دو۔ کیا تم یہ سب ختم کر لوگی؟''

''ہاں، میں کر لوں گی۔ چاول کھانا کوئی اتنا مشکل کام بھی نہیں ہے۔''

تینوں مرد اور لڑکا ایک بار پھر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے، جیسے لڑکی نے بہت انہونی اور مزاحیہ بات کہہ دی ہو۔ دونوں مردوں کا دم گھٹ گیا کیونکہ انھوں نے اپنے بھرے ہوئے منہ کے ساتھ بولنے کی کوشش کی۔ لڑکا بھاگ کر اُن کے لیے پانی کے گلاس لے آیا۔ توفہ نے لڑکی کے کان میں سرگوشی کی، ''کھاؤ، میری جان۔'' لڑکی جلدی سے بنچ پر بیٹھ گئی اور چاولوں کی پلیٹ اپنے قریب کھسکائی۔ وہ ہاتھ تک دھونا بھول گئی تھی۔ توفہ کا گرم سانس ابھی تک اُس کے کانوں میں تھا۔ اُس نے محسوس کر لیا کہ یہ توفہ بابو ہی تھا جس نے اس چھوٹے بندر کو اُسے پھانسنے کے لیے بھیجا تھا۔ شاید اُس نے بہت فاصلے سے ہی اُس کو دیکھ لیا تھا اور اُسے خاصی دیر اکیلا بیٹھے ہوئے دیکھ کر، اُس نے صحیح جانچ لیا تھا کہ اُس کے پاس جانے کے لیے کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اُس نے کھانا روکا، اپنا سر اُٹھایا اور دیکھا کہ دونوں مرد اپنا کھانا ختم کر چکے تھے۔ وہ بغور اُس کا جائزہ لے رہے تھے۔ اُس کی سماعت میں جلفو کی آواز گونجی، ''میں اسے لایا

ہوں۔ ”یہ کیسی زندگی ہے! احساس ذلت نے اُسے آلیا۔ اُس نے جلدی جلدی مٹھیاں بھر کر چاول اپنے منہ میں ڈالے۔ اُس کو کھانا بھلا لگا اور اُس کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھرا گئیں جو اُس نے اپنے بائیں ہاتھ سے صاف کیے۔ تینوں مرد اُس کے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔

”آپ کیوں رو رہی ہو؟“ ایک آواز نے پوچھا جیسے وہ نہیں پہچانتی تھی۔

”شہزادی، کس بات نے تمھیں رُلایا؟“ توفہ بھی باتوں میں شامل ہو گیا۔

لڑکی نے غیر یقینی نظروں سے اُن کو دیکھا، ”میں کیوں رونے لگی؟ میں کیوں روؤں گی جب میرے پاس چاول ہیں؟ میں بہت خوش ہوں۔ تم نے مجھے کھانے کے لیے بہت کچھ دیا ہے۔ میں نے ایک کھانے میں کبھی بھی اتنا گوشت نہیں کھایا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔“

”شہزادی، کیا تم آرام کرنا چاہتی ہو؟“

”ہاں، چاول کھانے کے بعد، مجھے بہت نیند آتی ہے۔“

اُس نے ایک بڑی ڈکار لی، ایک لمبی جمائی لی اور اپنی تھکی ہوئی آنکھوں کو زور سے رگڑا۔ اُس نے پلیٹ پر اپنے ہاتھ دھوئے اور پاؤں سمیٹ کر بینچ پہ بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنی پیٹھ، کندھے اور گردن ڈھانپنے کے لیے اپنی ساڑھی کا آنچل ٹھیک کیا لیکن اُس کی چھاتیاں ابھی بھی نمایاں تھیں۔ گہرے رنگ و رُوپ اور اچھے نین نقش کے ساتھ، اُس کا جسم غربت کے باوجود، صحت مند اور جوانی سے بھرپور تھا اور دل موہ لینے والا چہرہ اس کے علاوہ تھا۔ قصہ مختصر، اُس کی شخصیت پُرلطف تھی۔

لڑکی نے محسوس کر لیا کہ تینوں مرد ابھی تک اُس سے عشوہ گری کر رہے ہیں۔ اُس نے تسلی بخش معصومانہ مسکراہٹ کے ساتھ وہاں کھڑا رہنے کی کوشش کی۔ وہ مرد اُس کی مسکراہٹ کو نہ سمجھ سکے۔ یہ اتنی معصوم تھی جیسے ابھی تک دُنیا کا کوئی گناہ اُسے چھو کر بھی نہ گزرا ہو اور ایسے ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ کیا وہ ابھی ابھی آسمانوں سے اُتر کر نہیں آئی تھی؟ تینوں مرد مکمل طور پر دنگ رہ گئے۔

”شہزادی، تم کہاں سوؤں گی؟“

”یہیں، بنچ پہ ہی۔۔۔“

”کیا تمہارے پاس تکیہ اور کمبل ہے؟“

”نہیں، میں نے اپنے باپ کا گھر بہت ہی غصے کے عالم میں چھوڑا۔ میں تکیہ اور کمبل تو ایک طرف، اپنے کپڑے تک نہیں لا سکی۔“

”شہزادی، میں تمھیں تکیے اور کمبل دوں گا۔ میں ایک ٹرک چلاتا ہوں۔ تم میرے ٹرک میں سو سکتی ہو۔ حقیقت میں، تمھیں وہاں پہ بہت سکون ملے گا۔“

”نہیں، نہیں، وہ کیوں ٹرک میں سوئے گی؟ میں چار بنچوں کو آپس میں ملاؤں گا: ان پہ ایک گدا اور خوبصورت چادریں ڈالوں گا۔ تمھیں فوراً ہی نیند آ جائے گی جیسے ہی تم اس

پریشان کروں گی۔''
اس سے پہلے کہ دوسرا آدمی بولتا، توفہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا، ''اپنی بکواس بند کرو! نہیں تو مجھے تم لوگوں کو باہر پھینکنا پڑے گا۔''
''کیوں؟ میں کیوں نہ بولوں؟'' اُن دونوں میں سے ایک آدمی بولا جو وہاں کھانا کھا رہے تھے۔
''تم بھول رہے ہو کہ میں نے اُسے کھانا دیا۔''
''کتنے کا کھانا تھا؟ میں تمہیں پیسے دیتا ہوں۔''
''کیا؟ کیا تم مجھے اپنا پیسہ دکھا رہے ہو؟ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''
جب دونوں آدمی توفہ کو گھونسے مارنے کے لیے اُٹھے، لڑکی اپنے دونوں بازو پھیلا کر بھاگتی ہوئی آئی اور اُن کے درمیان کھڑی ہو گئی۔
''تم کیوں لڑ رہے ہو؟ تم لوگ مجھ سے کیوں نہیں پوچھتے کہ میں کہاں پہ سوؤں گی؟ تم لوگ خوامخواہ ہی جھگڑ رہے ہو۔''
ایک لمحے کے لیے، تینوں مردوں اور لڑکے نے خود کو احمق سمجھا اور بالکل خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ اب وہ اپنی اصلیت اُس پر ظاہر کر چکے تھے، وہ دونوں مرد لڑکی کو کسی بھوت کی طرح لگے۔ ایک کا ہڈیوں سے بھرپور جسم تھا جس پر گدھ کی طرح ٹیڑھا میڑھا چہرہ تھا۔ اُس کے بال چھوٹے چھوٹے تھے اور اُس کی کھردری آواز کسی اُلو کی طرح تھی۔ وہ کوئی پرانی پولیس والا لگتا تھا۔ دوسرا آدمی فلم کے کسی ولن کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اُس کی جن کی طرح آنکھوں میں، کسی قاتل جیسی بے رُوح سی تکتگی تھی۔ لڑکی کو اُس کا موٹا تازہ چربی زدہ جسم دیکھ کر متلی آنے لگی۔ ہر شخص ہوس کے ساتھ اُس کو تک رہا تھا اور وہ محظوظ ہو رہی تھی۔
اچانک، جلفو نے پوچھا، ''شہزادی آنٹی! تو آپ سوچ لو کہ آپ نے کہاں سونا ہے؟''
ایک لمحے کے توقف کے بعد، لڑکی نے جواب دیا،
''آج رات، میں یہیں سوؤں گی۔ کل رات میں ٹرک میں سوؤں گی۔ اب، ڈھاکہ شہر میں ہر کہیں ایک بستر میرا منتظر ہے۔'' لڑکی نے ایک اُونچا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا جس سے سارے مرد لطف اندوز ہوئے۔
توفہ بابو نے تحکمانہ لہجے میں کہا، ''شہزادی، میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔ تم اسی ہوٹل میں کام کروں گی اور میں تمہیں تنخواہ دوں گا۔ تم یہیں، میرے ساتھ رہوں گی۔'' لڑکی اپنے جسم کو لہراتے ہوئے کھلکھلا کے ہنسی۔ اُس نے توفہ کی رائے پہ کوئی توجہ نہ دی؛ اس کے بجائے اُس نے دونوں مردوں سے مخاطب ہو کر کہا،
''ابھی تم لوگ گھر جاؤ اور کل واپس آنا۔''
آج رات کے لیے اُن دونوں کے چلے جانے کے بعد، اُس نے اپنے پاؤں بنچ پہ سمیٹ لیے۔ دو منٹے گاہک کھانے کے لیے آئے اور توفہ اور جلفو اُن دونوں کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ دال، گوشت، چاول اور بھنے ہوئی سبزی کی بھری ہوئی پلیٹیں اُن کو لا

دی گئیں۔ انھوں نے جلدی جلدی اپنا کھانا ختم کیا اور چلے گئے۔ انھوں نے لڑکی کو دیکھ لیا تھا لیکن انہوں نے اُس پہ کوئی توجہ نہ دی۔ کم از کم، ابھی تک اس زمین پر کچھ انسان بس رہے تھے۔ اپنے ذہن میں انہیں خیالات کے ساتھ، لڑکی نے اپنا سر میز پر ٹکایا اور سوگئی۔

رات کے کسی پہر، لڑکی نے محسوس کیا کہ وہ لکڑی کے بنچوں کے جوڑے پر سوئی ہوئی تھی جن کو ملا کر ایک بستر بنایا گیا تھا۔ توفہ اُس کے قریب سویا ہوا تھا۔ وہ اُس رات گھر نہیں گیا تھا۔ اُس کے ننگے بدن پر حملہ آور ہونے کے بعد، وہ بے سدھ پڑا تھا۔ کیا وہ واقعی ہی سویا ہوا تھا؟ جب لڑکی نے اُسے کہنی ماری تو وہ بہت ہی دلفریب آواز میں گویا ہوا،

"شہزادی، کیا تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

"میرا نام گُری گاؤں ہے۔"

"کسی کو کسی بھی نام سے پکارا جا سکتا ہے۔"

"مجھے گُری گاؤں ہی کہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایسا ہی کروں گا۔ کیا تم خُوش ہو، گُری گاؤں؟ یا تمھیں کچھ اور چاہیے۔"

خُوش! لڑکی کی حالت رونے والی ہوگئی: اُسے دُکھ اور غم کا شدید احساس ہوا۔ وہ اپنا کنوارہ پن اُسی طریقے سے کھو چکی تھی: جس طرح زبردستی بستر سے دھکیل کر، دو مردوں نے اُسے اپنے کمرے سے پٹ سن کے کھیت میں لے جا کر نوچا تھا۔ اُس کو نہ تو خُوشی محسوس ہوئی اور نہ ہی اُداسی؛ اُسے اپنی پیٹھ پہ بچھو کے ڈنک جیسا درد محسوس ہوا اور شدید نفرت کی لہر اُس کے من میں لہرا گئی۔ توفہ دوبارہ اُس پر سوار ہو چکا تھا۔ اُس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ آج اُس کو اس بنچ پہ صرف ایک مرد کو مطمئن کرنا تھا۔ کل رات، ٹرک میں، اُسے دو مردوں سے نپٹنا پڑے گا۔ توفہ نے لڑکی سے دوبارہ پوچھا،

"گُری گاؤں، کیا تم خُوش ہو؟" تب لڑکی نے توفہ کو اپنی کہانی سُنانا شروع کی۔

"ایک دن، جب میرا باپ گھر پر نہیں تھا۔ تقریباً آدھی رات کے قریب، بجلو دیوار پھلانگ کر ہمارے گھر گھس آیا اور میرے کمرے میں داخل ہوگیا۔ بجلو کے ساتھ دو تین اور بندے بھی آئے تھے۔ انہوں نے میرا منہ کپاس کے تولیے کے ساتھ باندھا اور پھر اپنی باریاں لینے لگے۔ ہمارے ہمسایوں کو پتہ چل گیا اور انہوں نے بجلو کو پکڑ لیا لیکن دوسرے سارے بھاگ گئے۔ بجلو چیئرمین کا بیٹا ہے جس نے اس طرح کی کارروائیاں کئی دفعہ کی ہیں۔ ہر بندہ اُسے جانتا تھا۔ اگلے دن، میرے باپ کو ساری کہانی پتہ چلی اور وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ حواس کے بحال ہوتے ہی اُس نے انصاف کا مطالبہ کر دیا۔ پہلے، وہ اس مسئلے کو گاؤں کے سردار کے پاس لے گیا جس نے اُسے بتایا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ بجلو کا باپ، گاؤں کا چیئرمین بہت ہی طاقتور آدمی تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ ہماری زندگیاں تک تباہ

کر سکتا تھا۔ پھر میرا باپ پولیس کے پاس گیا جہاں پر اُن کو صرف و صرف پیسے سے مطلب تھا۔ کسی کو بھی پرواہ نہ تھی کہ ایک دیہاڑی کرنے والا مزدور اُن سے کیا کہنا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود بھی، وہ بجلو کے خلاف کیس کو سامنے لے آیا۔ بجلو کے باپ نے کیس ختم کرانے کے لیے پیسے کا خوب استعمال کیا۔ لیکن میرے باپ نے حقیقت کو بدلنے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتا رہ گیا کہ ایک ایسا ملک جہاں پر انصاف نہ ہو کبھی بھی مسائل سے چھٹکارہ نہیں پا سکتا۔ میں نے بھی اُسے کہا کہ وہ کیس ختم کر دے لیکن وہ کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ آخرکار، چیئرمین نے اپنے غنڈے بھیجے تا کہ ہمیں اپنے گھر اور گاؤں سے بے دخل کیا جا سکے۔ میں نے اپنے باپ کے ساتھ جا کر بجلو کے باپ سے التجا کی اور اُس سے معافی کی درخواست کی تا کہ ہم اپنے گھر میں واپس جا سکیں۔ میں نے کہا کہ ہم جیسے غریب لوگ، اتنے غرور اور عزت کے بھی جانبدار نہیں ہو سکتے۔ پورے گھر میں سارے لوگ صرف میری وجہ سے تکلیف کیوں برداشت کریں؟ میری ماں ہے، بھائی اور بہنیں ہیں؛ اب وہ سب کہاں رہیں گے؟ جب اُس نے میری التجا کی کوئی پرواہ نہیں کی، میں نے اپنا راستہ ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا۔ میں شہر جانے والی ایک بس پہ سوار ہو گئی اور اب میں یہاں ہوں۔۔۔‘‘

’’او ہو اچھا، پھر تو تم کنواری نہ ہوئی۔ یہ کام پہلے ہی کوئی تمہارے ساتھ کر چکا ہے۔‘‘

توفہ نے مایوسیانہ آواز میں کہا۔

’’اگر میں کنواری ہوتی تو کیا میں تمہیں اس طرح ہاتھ لگانے دیتی؟‘‘ ایک جھلکتی ہوئی بے عزتی کے ساتھ، الفاظ اُس کے منہ سے پھسلے جیسے ہی لڑکی نے بستر پر اپنا پہلو تبدیل کیا۔ توفہ گھر میں اپنی بیوی ہونے کے باوجود اُس کے ساتھ اپنا وقت گزار رہا تھا۔ اُس نے جلفو کو اُسے بتانے کے لیے بھیجا تھا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں نارایننگنج جا رہا ہے۔ جلفو اپنی عمر سے زیادہ چالاک لڑکا تھا اور سب کچھ سمجھتا تھا۔ شاید، ایک دن وہ بھی بغیر پیسوں کے اُس کے ساتھ سونے کی فرمائش کرے گا۔ لڑکی نے ایک لمبی سرد آہ بھری۔ اُسے بے عزتی محسوس نہیں ہو گی۔ اُس نے وہاں سب کچھ سیکھنا ختم کر دیا تھا کیونکہ وہ اب کافی کچھ سیکھ چکی تھی۔ توفہ نے اُس کی جوانی صرف

دو پلیٹ چاولوں

میں خریدی تھی۔

اگلی رات، اُسے کچھ رقم ضرور حاصل کرنا ہو گی۔ اُسے شدت سے رقم کی ضرورت تھی۔ توفہ کو اُس کی ساری خدمات کا معاوضہ چکانا پڑے گا۔ اُس نے بستر پر دوبارہ اپنا پہلو بدلا اور پوچھا،

’’کیا تم جاگ رہے ہو؟‘‘

’’کیا تم نے کچھ کہنا ہے؟‘‘

”کیا تم مجھے پیسے دے رہے ہو؟“
توفہ بلبلا اُٹھا، ”میں نے تمہارے کھانے اور سونے کا بندوبست کیا ہے۔ اس کے علاوہ تم مجھ سے پیسے بھی مانگ رہی ہو؟ تم نے کیا ہی کیا ہے؟“
”آہا! ہم دونوں اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے تمہارا کیا کام کیا ہے۔ اگر تم مجھے پیسے نہیں دو گے، میں تمہاری بیوی سے شکایت کردوں گی۔“
”کیا کہا ہے تم نے؟“
”جو بھی میں کہا وہ سچ ہی ہے۔ مجھے پیسوں کی اشد ضرورت ہے - میرا باپ جو دیہاڑی کا ایک مزدور ہے، اُسے گھر واپس لینے کے لیے رقم کی شدید ضرورت ہے جو میری وجہ سے اُس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ میں اُسے کچھ رقم بھیجنا چاہتی ہوں، گھر کے اخراجات کے لیے اور اس کی مرمت کے لیے بھی، کیونکہ جگلو نے میرے کمرے میں داخل ہونے کے لیے اس کی ایک دیوار توڑ دی تھی۔
”میرے خُدایا! مجھے تو اب پتہ چلا کہ تم بہت چالاک عورت ہو!“
”تم مجھے کتنے پیسے دو گے؟“
”میں تمہیں بتاؤں گا۔ مجھے اس بارے میں سوچنا پڑے گا----ایک دفعہ پھر؟“
”ٹھیک ہے۔ پھر حساب کرتے رہنا کہ تم نے مجھے کتنے پیسے دینا ہیں۔“
”کیوں؟ کیا تم گن نہیں رہی ہو؟“
”یقیناً، میں گن رہی ہوں۔“
”تم گنتی میں بہت اچھی لگتی ہو! تمھاری تعلیم کتنی ہے؟“
”اس طرح کے حساب کتاب کے لیے زیادہ تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ گنتی عورت خود بخود سیکھ جاتی ہے۔“
”دراصل، تم بہت اچھی طرح سیکھ چکی ہو۔“ توفہ دل کھول کر ہنسا۔
جب اگلی صبح سویرے، توفہ نے دوبارہ اُس کو ہلایا، لڑکی کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ زور زور سے چلائے۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ یہ جنگ زیادہ دیر نہیں لڑ سکتی۔ اُس نے سوچا کہ اُس کی زندگی دریا کی طرح تھی جو اُس کے گاؤں گری گاؤں کے ساتھ بہتا تھا۔ کبھی اس میں بڑے بڑے لدے ہوئے بحری جہاز سفر کرتے تھے لیکن اب یہ دریا ایک نہر سے زیادہ نہیں بچا۔ اس کا زیادہ طرح حصہ کٹاؤ کی وجہ سے ختم ہو چکا تھا اور اب اس میں دو کشتیاں بھی ایک ساتھ نہیں تیر سکتی تھیں۔ اُس نے خود کو بھی اس مردہ دریا کی طرح سمجھا جس کی زندگی سیم زدہ ہو چکی تھی جو کبھی بھی ٹھیک نہ ہونے والی تھی۔ کام ختم ہونے کے بعد، لڑکی کمرے سے باہر نکلی۔ ابھی بہت سویر تھی اور دن کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ سڑکیں بالکل خاموش تھیں۔ تمام لوگ اپنے اپنے گھروں میں سو رہے تھے۔ صرف وہ نہیں جانتی تھی کہ اُس نے کہاں جانا تھا۔ وہ واپس کمرے میں آئی اور توفہ کے ساتھ

لیٹ گئی۔ اُس نے یاد کیا کہ پچھلی رات وہ گھر نہیں گیا۔ اُس کی طرح، اُس کی بیوی نے بھی نیند کے بغیر رات گزاری ہوگی۔ اُس نے اُس کو بستر سے دھکیل دیا اور اُس پر لعنت بھیجی، "بے غیرت گدھ---!!!"

توفہ کی تجوری میں سے پیسے چھپانے کے بعد، لڑکی نے اپنی ساڑھی کے پلو کے آخر میں اُس رقم کو باندھا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ جب توفہ میز کے نیچے سے نکلا جہاں وہ لیٹا تھا لڑکی نے ایک رکشہ کر لیا تھا اور وہ وہاں سے رخصت ہوگئی۔

"کہاں جانا چاہتی ہو؟" رکشے والے نے پُوچھا۔ لڑکی نے بغیر کسی تکلف کے پُوچھا،

"بھائی۔ کیا تم کام ڈھونڈنے میں میری مدد کر سکتے ہو؟"

"کام؟ کیسا کام؟"

"کسی گھر میں کوئی کام کاج، یا کسی تعمیراتی جگہ پہ اینٹیں توڑنے کا کام، جہاں سے مجھے کچھ پیسے مل جائیں۔"

"پھر میری بیوی کے پاس جاؤ--- وہ تمھیں کوئی نہ کوئی کام ڈھونڈ کے دے گی چاہے وہ کوئی چھوٹا کام ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن میری ایک شرط ہے---"

"وہ کیا ہے؟"

"نوکری ملنے کے بعد، تمھیں میرے ساتھ ایک دن کے لیے سونا پڑے گا۔"

لڑکی کے قہقہے چھوٹ پڑے۔ دن کے اس وقت، سڑکوں پہ کسی قسم کا کوئی رش نہ تھا۔ ہوا میں تھوڑی سی خنکی تھی، اُسے اتنا اُونچا ہنسنا بہت بھلا لگا۔ اتنا اُونچا کہ رکشے والے نے واپس مڑ کر دیکھا اور اُس سے پُوچھا،

"تم ہنس کیوں رہی ہو؟"

"یہ سب سے آسان کام ہے جو میں کر سکتی ہوں۔" لڑکی نے کہا، "تم یہ کب کرنا چاہتے ہو؟ پہلی بار یہ مفت ہوگا؛ باقی تمام بار تمھیں پیسے دینا پڑیں گے۔ مجھے اپنے دیہاڑی دار باپ کو پیسے بھیجنا ہوتے ہیں، جو سراسر میری وجہ سے مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔"

"میں سمجھ گیا--- اور اگر میں تمھیں آج جیسی ٹھنڈی صبحوں میں رکشے کی مفت سواری دے کر تمہارا معاوضہ چکا دوں تو؟"

"نہیں، مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔ تم مجھ سے کام لینا چاہتے ہو لیکن مجھے پیسے دینے کے لیے راضی نہیں ہو--- اس طرح کیسے کام چلے گا؟" لڑکی نے اُونچی آواز میں جواب دیا۔

اُس آدمی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لڑکی کو اپنے گھر کے قرب و جوار میں لے گیا اور خاصے فاصلے سے ایک جانب اشارہ کیا۔

"اُس کے پاس جاؤ۔ وہ اینٹیں توڑتی ہے۔ اگر ممکن ہوا تو وہ تمھیں کام ضرور دے گی۔ ابھی میں تمھارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ لیکن تم نے اپنا وعدہ یاد رکھنا ہے۔" لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس کے بعد، اُسے یوں محسوس ہوا کہ یہاں

پر کام کی کوئی کمی نہ تھی۔ اب وہ باقاعدگی سے اپنے باپ کو رقم بھیجتی تھی۔

وہ ڈھاکہ شہر میں، لاکھوں لوگوں میں سے ایک ہو گئی تھی۔ وہ خود پہ عجیب و غریب سی خوشی محسوس کرتی۔ اگر وہ کرایہ نہ دے سکتی تو وہ گلیوں میں سو جاتی یا پھر کسی ٹرک کی چھت پر۔ ایک دفعہ، وہ کچھ مردوں کے ساتھ، ایک دوسرے شہر بھی گئی تھی اور وہاں پہ یادگار وقت گزارا تھا۔

ایک دن، اُس نے وہ مشکلات محسوس کیں جو چوبی کی حاملہ ماں گلی میں محسوس کرتی تھی۔

''تمھارے اتنے زیادہ بچے کیوں ہیں؟'' اُس نے ایک دن پوچھا تھا۔

''میں گلی میں سوتی ہوں: بھلا ہر رات، میں کتنے مردوں کو خلیج پر رکھ سکتی ہوں؟''

لڑکی ہکا بکا رہ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب و غریب سا خوف لہرایا۔ اُس نے جلدی جلدی حساب لگایا، اُس کو پچھلے مہینے ایام مخصوصہ میں حیض نہیں ہوا تھا۔ شاید یہ اسی وجہ سے ہو۔۔۔؟ اُسے صرف انتظار کرنا اور دیکھنا پڑے گا۔ دن گزرے اور حقیقت میں، اُس کو اس ننگے سچ کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اپنی پُرانی نوکری کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ کوئی بھی اُسے گھر میں نوکر رکھنے کو تیار نہ تھا۔ اب اُس کو صرف ایک ہی نوکری ملی تھی، ایک ہوٹل میں باروچی کے معاون کی نوکری، جس میں اُس کا کام مصالحے کوٹنے کا تھا۔ اُس کی چھوٹی سی تنخواہ میں اتنی رقم ہی ہوتی کہ وہ ایک دن سے دوسرے دن تک، بمشکل گزارہ کرتی۔ لوگ اُس کے بڑے پیٹ کا حقارت کے ساتھ مذاق اُڑاتے۔ کچھ اُس کا منہ چڑاتے جبکہ کچھ کبھی کبھار اُس کے کپڑوں میں پانچ روپے کا ایک نوٹ اڑوس دیتے۔ ابھی بھی، لڑکی چاہتی تھی کہ وہ ڈھاکہ شہر کے اس اصطبل میں، کسی معجزانہ بچے کو جنم دے۔ ایک ایسا بچہ، جو ڈھاکہ شہر سے ساری گندگی کو دُور باہر کرے اور یہ اعلان کرے، ''دیکھو میں تاں کہتا تھا کہ یہ شہر بہت خوبصورت ہے۔۔۔!!!'' مرد اپنے دلوں کو ٹٹولیں گے اور وہاں اُن کو کوئی گندگی نظر نہیں آئے گی بلکہ صرف و صرف صاف و شفاف پانی نظر آئے گا۔ لیکن اُن میں سے کچھ ایسے بھی ہوں گے جن کے پتھریلے دل اتنے صاف شفاف پانی سے بھی نہ دُھل سکیں گے۔ وہ ہاتھوں میں پھندے لے کر ہر وقت تیار ہوں گے اور غراتے ہوئے کہیں گے،

''شہر کو صاف کرو! جلدی کرو۔۔۔! اوہ۔۔۔! اس جُرم کے لیے تمہاری سزا موت ہے۔۔۔!''

ٹھٹکتے ہوئے، لڑکی نے خوفزدہ ہو کر اپنے دن بدن بڑھتے ہوئے پیٹ کو چھوا۔ چوبی کی ماں نے ایک بار اشارہ دیا تھا کہ وہ جڑواں بچوں کی ماں بنے گی۔ لڑکی ہنسی تھی، ''ایک کے بجائے، مجھے اس مزدوری کے دو بچے ملیں گے۔ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔''

"یہ تو اچھی بات ہے۔ لیکن ان کے باپ کا کوئی اتا پتہ نہیں ہے۔ تم ان کو کیسے پالوں گی؟"

"گلی میں پیدا ہونے بچوں کو بڑا ہونے کے لیے رقم کی ضرورت نہیں ہوتی؛ وہ خود بخود بڑے ہو جاتے ہیں۔"

وہ دوبارہ کھلکھلا کر ہنسی۔ اُس کا بھی ایک باپ تھا جو ایک دیہاڑی دار مزدور تھا۔ وہ اُس کی زندگی میں کتنا فائدہ مند ثابت ہوا تھا۔ وہ حیران تھی۔

یہ عام سی نیلی چاندنی والی رات تھی۔ لڑکی کو مزدوری جیسے درد کی ٹیسیں اُٹھیں۔ وہ کچی آبادی میں اپنے گھر سے باہر نکلی۔ درد آہستہ آہستہ بڑھتا گیا جو لہروں کی طرح اُس کے سارے جسم میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ وہ خاموش گلی کے درمیان بیٹھ گئی۔ رات کی سرد ہوا نے اُس کے جسم کو ٹھٹھرا کر رکھ دیا۔ وہ اس شدید درد پہ قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس کی چیخوں نے ہمسائے میں سارے کتوں کو متوجہ کر دیا تھا۔ وہ آ کر اُس کے قریب بیٹھ گئے اور کبھی کبھار اُس کا سر چاٹنے لگتے۔

اُس رات، اُس نے دو بچوں کو جنم دیا، ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس شہر کی یہ گلی جو نکاسی کے کسی نالے کی طرح گندی تھی، پورے چاند کی کسی رات میں کبھی اتنی خوب صورت بھی ہو سکتی ہے۔ آخری کچھ مہینوں میں، اُس نے اس شہر میں، خوب صورتی کی کوئی بھی شے محسوس نہیں کی تھی۔ کسی نہ کسی طرح، وہ اُٹھنے میں کامیاب ہو گئی اور اپنی کمر بند میں سے اپنا پرس نکالا اور اُس میں سے ایک نیا بلیڈ نکال کر بچوں کی نال کاٹ کر اپنی ناف سے الگ کیا۔

لڑکی جانتی تھی کہ ابھی کچھ دیر میں صبح ہو جائے گی۔ کچی آبادی میں سے عورتیں، اُسکی دوست اُس کو تلاش کرتی ہوئی آئیں گی اور اُسے اس گلی میں پائیں گی۔ وہ بچوں کو دیکھیں گی اور ایک دوسرے کو کہیں گی،

"دیکھو! گری گاؤں نے بالآخر کچھ اچھا کیا ہے۔ اُس نے ایک ہی وقت میں دو بچوں کو جنم دیا ہے۔ ایک چھوٹی سی خوب صورت لڑکی اور ایک پیارا سا چھوٹا لڑکا! آؤ ان کو اُٹھائیں اور ان کو گھر لے چلیں۔ ہم اُن کو سب کچھ دیں گے جو بھی ہمارے پاس ہے۔ اور، اری گری گاؤں! کیا اب آخرکار تم ہمیں اپنا اصل نام بتاؤ گی؟"

لڑکی نے اپنا سر خوشی کے مارے جھٹکا۔ وہ بہت زیادہ خوش تھی۔ وہ چلائی، اُس کی آواز خوشی کے مارے بلند ہو گئی۔

"ہاں، میں بتاؤں گی۔ میں ہر کسی کو خوشی خوشی اپنا نام بتاؤں گی۔ سنو! سب سنو جو بھی اس شہر میں رہتا ہے! میرا نام پُش پالاتا ہے۔ پھیلنے والا پھول۔۔۔اور مجھ میں یہ طاقت ہے کہ میں ہزاروں پھول کھلا سکتی ہوں۔"

☆☆☆☆☆

عابی

وسیم جبران

نہ جانے کیا بات تھی، عابی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ اس وقت کچن میں برتن دھو رہا تھا۔ شام کو گھر میں پارٹی تھی۔ مہمان کافی زیادہ تھے۔ لہٰذا گندے برتنوں کی تعداد بھی کافی زیادہ تھی۔ باورچی نے کئی قسم کے کھانے بنائے تھے۔ اب وہ شاید اپنے کوارٹر میں پڑا خراٹے لے رہا ہوگا۔ یوں بھی برتن دھونا اس کی ڈیوٹی میں شامل نہیں تھا۔ ڈرائیور سے خیر یہ توقع کی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ رہ گیا عابی تو اس کی حیثیت کا تعین کرنا مشکل تھا۔ گھر کی صفائی کرنا۔ لان میں گھاس کاٹنا، پودوں کو پانی دینا، کپڑے دھونا، جوتے پالش کرنا اور گھر کے تمام چھوٹے چھوٹے کام کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔

گھر کے باقی ملازمین اور اس میں ایک فرق نمایاں تھا۔ ڈرائیور اور باورچی کو مہینے کے ابتدائی دنوں میں تنخواہ ملتی تھی جبکہ عابی کی کوئی تنخواہ نہیں تھی۔ وہ تو قرض اتار رہا تھا۔ ایک ایسا قرض جو اس نے نہیں لیا تھا۔ لیا تو اس کے ماں باپ نے بھی نہیں تھا۔ وہ دونوں شوکت نظامی کے ہاں ایک مدت سے ملازمت کرتے تھے اور اسی بنگلے کے ایک کوارٹر میں رہائش پذیر تھے۔ اگرچہ دونوں صحت مند تھے مگر موت کے آگے کس کا زور چلتا ہے۔ ایک دن وہ اپنے پاؤں پر چل کر باہر گئے تھے مگر ان کی واپسی ایمبولینس میں ہوئی۔

عینی شاہدین کے مطابق سڑک پار کرتے ہوئے ایک تیز رفتار کار نے انہیں ٹکر ماری تھی۔ گاڑی حادثے کے بعد فوراً ہوا ہوگئی تھی۔ شاید کسی نے اس کا نمبر نوٹ کیا تھا مگر پولیس اس گاڑی کو چلانے والے شخص کو گرفتار نہیں کرسکی تھی۔ بس اتنا معلوم ہوسکا تھا کہ وہ گاڑی نئے ماڈل کی بی ایم ڈبلیو تھی۔ چناں چہ یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں تھا کہ وہ کسی بااثر شخص کی گاڑی رہی ہوگی۔

شوکت نظامی نے اپنے ملازمین کے کفن دفن کے فوراً بعد عابی کو بلا کر حکم صادر کیا تھا کہ آج کے بعد وہ اپنے والدین کی جگہ پر کام کرے گا لیکن چوں کہ اس کے والدین کی تجہیز تکفین پر کافی خرچ اٹھا ہے اس لیے اسے تنخواہ نہیں ملے گی البتہ وہ اس پر رحم کھاتے ہوئے اسے کھانا، کپڑے اور رہائش فراہم کریں گے۔ بعدازاں انھوں نے کسی نامعلوم قرض کر ذکر کر کے ہمیشہ کے لیے تنخواہ کا باب بند کردیا تھا۔ عابی برتن دھوتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس کی غلامی

دائی ہے یا کسی روز وہ اس عذاب سے نجات پا جائے گا۔
اس کی عمر محض دس بارہ برس تھی۔ اس کے والدین نے اسے ایک سرکاری سکول میں داخل کروایا تھا وہ چوتھی جماعت تک پڑھا تھا۔ والدین کے مرتے ہی تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہو چکا تھا کیوں کہ شوکت نظامی کے بقول سکول جانے سے وقت ضائع ہوتا تھا اور ان کے گھر کے کام کا حرج ہوتا تھا۔ عابی کے آنسو اس کے گالوں سے لڑھکتے ہوئے فرش کو بھگو رہے تھے۔ اس نے نہ آنسو پونچھنے کی کوشش کی تھی نہ اپنے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کی تھی اس کا خیال تھا کہ یہاں کون ہے جو اسے یوں بے بسی سے آنسو بہاتے ہوئے دیکھے گا مگر وہ غلطی پر تھا۔ وہ کسی کی نگاہوں میں تھا۔
وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پہلے بھی اسے دیکھا تھا جب اس کے قہقہے اس گھر میں گونجتے تھے۔ تب اس کے والدین حیات تھے۔ اب تو اس کے لبوں پر کبھی مسکراہٹ بھی نہیں آتی تھی۔ وہ اسے روز دیکھتی تھی۔
اس نے کئی بار شوکت نظامی کو اس پر چلاتے دیکھا تھا۔ بعض اوقات شوکت نظامی کو کسی بات پر غصہ آتا تو وہ عابی کو مار پیٹ کر اپنا غصہ نکالتا تھا۔ ایسے میں وہ بہت بے چین ہو جایا کرتی تھی۔ شوکت نظامی مار پیٹ کرنے میں بڑا بے رحم واقع ہوا تھا۔ ایسے میں وہ سوچا کرتی تھی کہ یہ کیسا انسان ہے جو اپنے جیسے انسان کو ایسے مارتا ہے جیسے وہ کوئی جانور ہو۔
حالانکہ جانور کو بھی ایسی بے دردی سے مارنا کربناک ہے۔ پتا نہیں شوکت کا مسئلہ کیا تھا۔ شاید وہ کسی پیچیدہ نفسیاتی بیماری کا شکار تھا۔ ایک بچے پر تشدد کر کے وہ نہ جانے کس جذبے کی تسکین کرتا تھا۔ اسے بار بار موقع بھی مل جاتا تھا۔ کبھی عابی کے ہاتھ سے گر کر گلاس ٹوٹ جاتا یا فرش پر گرد نظر آتی تو شوکت کے ہاتھوں میں خارش ہونے لگتی جو عابی کو مار پیٹ کر ہی دور ہوتی تھی۔ عابی بڑی دیر تک برتن دھوتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے یہ کام ادھورا چھوڑ دیا تو کل اس کی شامت آ جائے گی۔ پچھلی بار جب ایسا ہوا تھا تو اس کے جسم پر کئی جگہ نیل پڑ گئے تھے اور پھر کئی دن تک اس کے جسم کی بوٹی بوٹی درد کرتی رہی تھی۔ وہ ایسا کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔
کام ختم کر کے مڑا تو وہ یک دم ایک ستون کے پیچھے چھپ گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عابی کی اس پر نظر پڑے۔ عابی ستون کے پاس سے گزر کر اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ اس کی کمر میں شدید درد تھا۔ ہاتھ پاؤں اور ٹانگیں پھوڑے کی طرح دکھ رہی تھیں۔ وہ اپنے بستر پر گر پڑا۔ تھکن کی وجہ سے اسے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ ایسے میں اسے اپنی ماں کی یاد آ گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ جب کبھی وہ ذرا سا تھک جاتا تھا تو اس کی ماں اسے دبایا کرتی

تھی۔ وہ منع کرتا مگر اسے کی ماں پھر بھی اسے دباتی تھی۔ چند منٹ میں ہی اس کا بدن پھول کی طرح ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔

ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"ماں، میری ماں، تم کیوں چلی گئیں۔ ماں تمھارے بغیر میرا دل نہیں لگتا۔ تم نے اگر جانا ہی تھا تو مجھے بھی ساتھ لے جاتیں۔ مجھے تمھاری بہت یاد آتی ہے۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ مجھے اپنے پاس بلا لو ماں۔ مجھے اپنے پاس بلا لو۔" وہ روتے روتے اپنی ماں کو پکار رہا تھا۔ پھر اسے اپنا باپ یاد آ گیا۔

"ابو۔ ابو۔ مجھے سکول جانا ہے، مجھے میرے دوست یاد آتے ہیں۔" وہ اپنے ماں باپ کو یاد کرتے کرتے سو گیا۔

وہ اس کے پیچھے پیچھے اس کے کوارٹر میں آ گئی تھی۔ جب وہ سو گیا تو وہ اس کے قریب آ گئی۔ وہ غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جس پر معصومیت کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر اس کے سرہانے کے پاس موجود رہی اور اسے دیکھتی رہی۔ بڑی شدت سے اسے خیال آ رہا تھا کہ وہ اس کے لیے کچھ کر سکے۔ مگر وہ کیا کرے۔ پھر وہ چلی گئی۔

عابی اتنا تھکا ہوا تھا کہ صبح جلد بیدار نہ ہو سکا۔ ناشتے پر بیگم شوکت نے عابی کی غیر موجودگی کو محسوس کیا تو باورچی سے پوچھا۔

"جی وہ شاید اپنے کوارٹر میں مزے سے سو رہا ہوگا، آج اس نے ناشتہ بنانے میں میری کوئی مدد نہیں کی، میں اکیلا ہی کھپتا رہا ہوں۔" باورچی نے منہ بنا کر بتایا۔

"دیکھ رہے ہیں آپ! یہ لڑکا تو خود کو رئیس زادہ سمجھتا ہے۔" بیگم شوکت نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو، مجھے باہر جانا ہے ورنہ اس کم بخت کو ابھی سبق سکھا دیتا۔ خیر شام کو دیکھا جائے گا۔" شوکت نظامی نے فوراً کہا۔

"اختر تم ابھی جا کر اسے جگاؤ اور اس سے کہو کہ گھر کی صفائی کرے میری ایک سہیلی نے ملنے آنا ہے۔" بیگم شوکت نے باورچی سے کہا۔

"جی بیگم صاحبہ۔" باورچی نے بڑی فرمانبرداری سے کہا اور اسے کوارٹر کی طرف چل دیا۔

شوکت نظامی تو چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد عابی اپنے کوارٹر سے نکلا اور صفائی کرنے لگا۔ تھکن اب بھی تھی اسی لیے کچھ سست لگ رہا تھا۔ اسے آرام سے کام کرتے دیکھ کر بیگم شوکت کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"اے ذرا تیز ہاتھ چلاؤ، ہاتھوں پیروں میں جان نہیں ہے کیا؟" بیگم شوکت نے چیختے ہوئے کہا۔

"جی کر تو رہا ہوں۔" عابی کے منہ سے نکلا۔

بیگم شوکت نے یہ جواب سنا تو اسے دو چار موٹی موٹی گالیاں دیں پھر اس کی ماں کو برا بھلا کہنے لگی۔

"زبان درازی کرتے ہو، تمھاری ماں نے

ہی تمھیں یہ سکھایا ہوگا۔ وہ بھی بڑی زبان دراز تھی۔''
اپنی ماں کی توہین پر اس کا خون کھول اٹھا مگر وہ بے بس تھا۔ اس نے زخمی نظروں سے بیگم شوکت کو دیکھا۔ بیگم شوکت کو اس کا یوں دیکھنا بہت برا لگا اس نے آگے بڑھ کر عابی پر تھپڑوں کی بارش کردی۔
''خبردار جو آئندہ ایسے آنکھیں دکھائیں۔ آنکھیں پھوڑ دوں گی تمھاری۔ چلو جلدی کام ختم کرو۔'' بیگم شوکت پاؤں پٹختے ہوئے اندر چلی گئی۔
عابی پھر کام میں جت گیا۔ عابی کے لیے آج کا دن بھی خاصا مشکل تھا۔ صبح بیگم شوکت سے تھپڑ کھائے تھے شام کو شوکت نظامی آ گئے۔ بیگم شوکت نے خوب مرچ مسالہ لگا کر اپنے خاوند کو بتایا کہ عابی کتنا باغی ہو رہا ہے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے تو گھورتا ہے۔
شوکت نظامی کی جیسے مراد بر آئی۔
''تم فکر نہ کرو میں اس کی طبیعت صاف کرتا ہوں۔'' شوکت نے اپنی بیوی کو دلاسا دیا۔
وہ ایک آڑ کے پیچھے سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ شوکت نظامی نے زوردار آواز دے کر عابی کو بلایا۔
عابی کسی مجرم کی طرح سر جھکائے اس کے سامنے آ گیا۔
''اختر ذرا ایک چھری تو لے کر آؤ۔'' شوکت نے سرد لہجے میں کہا۔
اختر فوراً بھاگ کر چھری لے آیا۔ شوکت نے ڈرائیور کو بھی آواز دے کر بلا لیا۔ آج اس کے ارادے کچھ زیادہ خطرناک لگ رہے تھے۔
''ہاں میاں صاحب زادے! لگتا ہے تمھارے دماغ میں کوئی کیڑا اپل رہا ہے۔ اب اس کو تو مارنا پڑے گا ناں۔'' شوکت نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
عابی بری طرح گھبرا رہا تھا جب کہ بیگم شوکت یہ منظر بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔
''اختر تم اس کے کپڑے اتارو تاکہ چھری اور اس کے جسم کا ڈائریکٹ ملن ہو۔'' شوکت نے ہنستے ہوئے کہا۔ اختر بھی مسکرا اٹھا اور عابی کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک آ گئی تھی۔
عابی کا شرم اور بے بسی سے برا حال تھا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یہاں سے بھاگ جائے۔ شاید شوکت کو بھی اس کا اندازہ ہو رہا تھا۔
''ڈرائیور اس کو پکڑ لو۔'' شوکت نے حکم دیا۔ ڈرائیور جیسے اسی حکم کا منتظر تھا۔ اس نے فوراً عابی کو جکڑ لیا۔ عابی اس کے بازوؤں میں مچلنے لگا۔
''مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو۔'' وہ چلانے لگا۔ شوکت اور بیگم شوکت ہنسنے لگے۔
وہ پودے کی آڑ سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کی رگ رگ میں غصے کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اسے اس بچے پر ترس آ رہا تھا۔ اس کے لیے فوری طور پر کچھ کرنا ہوگا۔ ورنہ یہ بے چارہ آج

نہ جانے کس عذاب کا شکار ہوگا۔
ادھر شوکت شاید اس صورت حال کو انجوائے کر رہا تھا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ اختر نے عابی کی قمیض اتاری۔ تو وہ اور زور سے چیخنے لگا۔ شوکت نے آگے بڑھ کر دو تین چھڑیاں اس کی کمر پر ذرا نرمی سے ماریں جیسے کوئی بلی چوہے کو قابو کرنے کے بعد اس سے کھیل رہی ہو۔ بیگم شوکت بھی قریب آ گئی۔ شوکت نے چھڑی سے اس کی پیٹھ پر دو تین ضربیں لگائیں۔
"اختر کچھ مزہ نہیں آ رہا۔ اس کی شلوار بھی اتار دو۔" شوکت نے کہا۔
"ابھی لیجیے حضور!" اختر بولا۔
عابی چیخنے لگا۔ یہی وہ وقت تھا جب وہ جھاڑی کے پیچھے سے نکل کر شوکت کے پیچھے آ چکی تھی۔ سب کا دھیان عابی کی طرف تھا لہٰذا کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا مگر عابی کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ چیختے چیختے یک دم خاموش ہو گیا۔
"کیا ہوا صاحبزادے! لگتا ہے تم ہماری بات ماننے کے لیے تیار ہو گئے ہو۔ چلو شاباش جلدی کرو۔" شوکت نے طنزیہ انداز میں کہا۔
عابی کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ شوکت کے پیچھے تھی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے وار کر دیا۔ فضا میں دو چیخیں گونجیں۔ پہلی چیخ شوکت نظامی کی تھی اور دوسری چیخ بیگم شوکت نظامی کی۔ چیخوں کی آواز سن کر اختر اور ڈرائیور نے پلٹ کر دیکھا۔ تب تک وہ ان کی پہنچ سے دور جا چکی تھی۔ انھوں نے اسے دیکھ لیا تھا مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ شوکت اور بیگم شوکت زمین پر گر چکے تھے۔ ان دونوں کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہی دونوں تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ اختر اور ڈرائیور کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔
چیخ پکار کی آواز سن کر ساتھ والی کوٹھی کا چوکیدار گیٹ پر آیا۔ اس نے یہ منظر دیکھ کر پولیس کا فون کر دیا۔ جب پولیس پہنچی تو اختر اور ڈرائیور ڈرے سہمے لاشوں کے پاس بیٹھے تھے جبکہ عابی ان سے کچھ فاصلے پر لان میں بیٹھا تھا۔
"کیا ہوا تھا؟" پولیس انسپکٹر نے پوچھا۔
"بڑی زہریلی ناگن تھی جناب۔ مالک اور مالکن کو ڈس کر نہ جانے کہاں چھپ گئی ہے۔ ہمیں تو بہت ڈر لگ رہا ہے، وہ اسی بنگلے میں کہیں چھپی ہوئی ہے۔" اختر نے بتایا۔
"ہوں۔ وہ بچہ کون ہے؟"
"یتیم ہے بے چارہ۔ اس کے ماں باپ بھی یہیں کام کرتے تھے۔" اختر بولا۔
"ادھر آؤ بیٹے! تمھارے رشتہ دار ہیں؟" پولیس انسپکٹر نے پوچھا۔
"جی نہیں میرا کوئی نہیں ہے۔" عابی نے کہا۔
"میں آپ کو ایدھی سنٹر میں پہنچا دیتا ہوں۔"
عابی مطمئن انداز میں پولیس والوں کے ساتھ چل پڑا۔ ناگن اس وقت بھی جھاڑیوں کے پیچھے سے اسے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

”خاموش چیخ“

کمرے میں پردے بند تھے۔ سورج کئی بار نکلا، کئی بار غروب ہوا، مگر اندر وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ زارا کا کمرہ صاف تھا، سجا ہوا بھی تھا، لیکن ہوا میں ایک خاموشی تھی... ایسی خاموشی جو چیخ رہی تھی، مگر کوئی سن نہ رہا تھا۔

زارا بیڈ پر بیٹھی تھی۔ نہ کتاب پڑھنے کا دل کرتا، نہ فون اٹھانے کا۔ نہ بھوک لگتی، نہ نیند آتی۔ وہ صرف بیٹھی رہتی تھی... جیسے زندگی کہیں پیچھے رہ گئی ہو، اور اب اس کا وجود صرف جسم تک محدود ہو چکا ہو۔

زارا کون تھی؟

زارا ایک پڑھی لکھی، بااعتماد، اور خوش مزاج لڑکی سمجھی جاتی تھی۔ یونیورسٹی میں سب کی دوست، ٹیچرز کی پسندیدہ، اور والدین کی آنکھوں کا نور۔ انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا، پھر ایک معروف ادارے میں نوکری ملی۔

زندگی دیکھنے میں مکمل تھی..... مگر اصل کہانی کہیں اور تھی۔

بچپن میں ہی زارا نے وہ سب دیکھا جو شاید ایک حساس دل پر بہت بھاری ہوتا ہے۔ باپ کی غصے بھری چیخیں، ماں کی خاموش سسکیاں اور ایک بچی جو ہمیشہ درمیان میں ہوتی۔ وہ چھپ کر روتی، کبھی چھت پر، کبھی واش روم میں۔ مگر سب کے سامنے مسکراتی رہتی۔

وقت گزرا، باپ کا رویہ بدلا، ماں نے معاف کیا، اور زارا نے سب بھلا دینے کی کوشش کی۔ لیکن دل کی تہہ میں جو دُکھ دبا ہو، وہ کب بھولتا ہے؟

نوکری کے چند سال بعد، اچانک زارا کی طبیعت میں تبدیلی آنا شروع ہوئی۔

باہر ہنسی، اندر خالی پن۔

کام پر جانا بوجھ لگنے لگا، لوگوں سے بات کرنا مشقت بن گئی۔

وہ بار بار بیمار ہونے لگی، مگر رپورٹس نارمل آتیں۔

ماں کہتی،

”بیٹا شاید تھکن ہے، کچھ دن چھٹی لے لو۔“

زارا صرف سر ہلا دیتی۔

کچھ ہی مہینوں میں، وہ دوستوں سے دور، محفلوں سے بیزار، اور بستر سے بندھ گئی۔

اب وہ دن میں بھی پردے بند رکھتی۔ موبائل پر درجنوں مسڈ کالز، مگر کوئی جواب نہیں۔

ایک دن چھوٹا بھائی عمر کمرے میں آیا اور حیرت سے بولا:

”آپ اتنے دنوں سے باہر نہیں نکلیں... سب پریشان ہیں۔“

زارا نے دھیمی آواز میں کہا:

”عمر...... مجھے کچھ نہیں چاہیے، بس تنہا رہنے دو۔“

عمر چپ ہو گیا۔ وہ پہلی بار اپنی بہن کو اتنا ٹوٹا

کومل شہزادی

ہو دیکھ رہا تھا۔
ایک رات زارا کی ماں اس کے بستر کے پاس بیٹھی تھی۔
"بیٹا، میں ماں ہوں۔ تم چاہے کچھ نہ کہو، میں سب جانتی ہوں۔ تم بہت تھکی ہوئی لگتی ہو... اندر سے۔"
زارا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سالوں کا بوجھ، چھپی ہوئی چیخیں اور نہ کہی باتیں آخرکار زبان پر آ گئیں۔
"امی... میں روز زندہ ہونے کی اداکاری کرتی ہوں... پر اندر سے مر چکی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم میں کون ہوں، یا مجھے کیا چاہیے۔ مجھے لگتا ہے سب بیکار ہے.. میں بیکار ہوں۔"
ماں نے اس کے ہاتھ پکڑ کر کہا:
"بیٹا، یہ سب تمھاری غلطی نہیں۔ یہ بیماری ہے، جسے ہم نے کبھی سمجھا ہی نہیں۔ لیکن اب سمجھیں گے... تم اکیلی نہیں ہو۔"
ماں نے نفسیاتی ماہر سے وقت لیا۔
زارا پہلی بار کسی سے اپنے دل کی بات کہہ رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو، آواز بھاری، لیکن دل تھوڑا ہلکا۔
ڈاکٹر نے بتایا:
"یہ ڈپریشن ہے، اور بالکل عام ہے۔ ہم اس پر کام کریں گے۔ دوا بھی ہے، مشورے بھی... لیکن سب سے ضروری ہے وقت، صبر، اور خود پر رحم۔"
زارا کو لگا کسی نے آخرکار اسے سمجھا۔
ہفتوں کے سیشن، دوا، تھوڑا چلنا، کچھ لکھنا، کچھ بولنا..... آہستہ آہستہ زارا کی دنیا بدلنے لگی۔
اس نے دوبارہ ڈائری لکھنا شروع کی، دن میں کھڑکی کھولنے لگی، اور سب سے بڑھ کر — وہ خود سے بات کرنے لگی۔
ایک دن، اس نے آئینے میں خود کو دیکھا، اور بہت عرصے بعد کہا:
"زارا..... تم بہت مضبوط ہو۔"
ماں مسکرا رہی تھی، عمر اس کے لیے چائے بنا رہا تھا۔
دن وہی تھے، کمرہ وہی، مگر زارا اب ویسی نہ تھی۔
اب زارا ایک فلاحی ادارے سے منسلک ہے، جہاں وہ ذہنی صحت پر کام کر رہی ہے۔ وہ نوجوانوں کو سننے، سمجھنے اور سہارا دینے کا کام کرتی ہے۔
ایک بار کسی نے اس سے پوچھا:
"تم اتنی مضبوط کیسے ہو گئی؟"
وہ مسکرا کر بولی:
"میں ٹوٹ گئی تھی، لیکن مجھے کسی نے تھاما..... اب میں دوسروں کو تھامنے کی کوشش کر رہی ہوں"۔
"ڈپریشن ایک خاموش دشمن ہے، جو آہستہ آہستہ انسان کو ختم کرتا ہے۔ یہ کمزوری نہیں، نہ شرمندگی کی بات ہے۔ جیسے ہم بخار یا زخم کا علاج کرتے ہیں، ویسے ہی دل اور دماغ کے زخموں کا بھی علاج ضروری ہے۔"
"کسی کی خاموشی کو معمولی نہ سمجھیں — کبھی کبھار سب سے بلند چیخیں وہی خاموش دل مار رہا ہوتا ہے۔"

☆☆☆☆☆

ڈرامہ: سوشل میڈیا کی کراماتی محفل

Inspired by ابلیس کی مجلس شوریٰ

کردار 1: یوٹیوب

کردار ۲: انسٹاگرام

کردار ۳: سیلفی

کردار ۴: فیس بک

کردار ۴: چیٹ جی پی ٹی

کردار ۵: سردار، موبائل

کردار ۷: امید کی کرن

کردار ۹: شرافت

کردار ۱۰: ایمان

کردار ۱۱: اخلاق

(دربار کا منظر دکھایا جاتا ہے پیچھے خوفناک میوزک چلایا جائے گا)

موبائل فون اپنے درباریوں سے:

سوشل میڈیا کے عہدیدارو

بتاؤ جو ذمہ داریاں میں نے اپنے پچھلے اجلاس میں تمھیں سونپی تھیں۔۔۔ان کی کیا صورت حال ہے۔

یوٹیوب: عالی جاہ! آپ کا اقبال بلند ہو۔ آپ کے حکم کے عین مطابق میں نے ساری نوجوان نسل کو مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ میری کوئی بھی ویڈیو دو گھنٹے سے کم نہیں ہے۔۔ جس کی وجہ سے لوگ آپ کی سکرین سے نظریں نہیں ہٹا سکتے۔

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب

میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں

(تمام درباری اونچا قہقہہ لگائیں گے پیچھے خوفناک میوزک بلند ہوگا)

فیس بک: ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا

کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام

یوٹیوب کی بات درست ہے لیکن یوٹیوب کی زیادہ تر ویڈیوز میری ہی وجہ سے صارفین، ناظرین اور حاضرین تک پہنچتی ہیں۔ میں

سیدہ آمنہ ریاض

حالات حاضرہ لوگوں تک پہنچانے کا تیز ترین ذریعہ بن چکا ہوں۔۔

موبائل: یہ تو مثبت کارنامہ ہے۔۔۔ مجھے تباہی کی کوئی خبر سناؤ تاکہ میرا سیروں خون بڑھ سکے۔

انسٹاگرام: عالی جاہ! شاید میری خدمات ابھی آپ تک پہنچی نہیں ہیں۔ میری ریلز چوبیس گھنٹے گردش کرتی رہتی ہیں۔۔۔ میں خون کی طرح نوجوان نسل کی رگوں میں سرایت کر چکا ہوں۔ میری رنگینیاں اور رعنائیاں اب لوگوں کا اوڑھنا بچھونا بن چکی ہیں۔۔ میرے بغیر اب عوام کا جینا ممکن نہیں۔۔۔

جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کرسکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں

موبائل: (اس کو تھپکی دیتے ہوئے کہتا ہے): شاباش! مجھے تمھارے کارنامے سن کر خوشی ہوئی۔

(فیس بک، انسٹاگرام کی کامیابی پر منہ بنانے لگتا ہے)

چیٹ جی پی ٹی غرور سے: عالی جاہ!

خبر ہے سلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

کیا آپ ان لوگوں کی کامیابی کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں؟۔ تو پھر گھی کے چراغ جلایئے۔ کیونکہ جو کام میں نے سرانجام دیا ہے وہ آپ کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی ہے۔

موبائل: جلدی سناؤ آخر ایسا کونسا کارنامہ ہے؟

چیٹ جی پی ٹی: سرکار میں نے تو نوجوان نسل کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم کر دی ہے۔۔ دنیا میں ہر طرف میرا ہی چرچا ہے۔ میں نے ان کے دماغوں کو ہی اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔۔۔ اب دنیا پر صرف میری ہی حکومت ہوگی۔۔۔

(چیٹ جی پی ٹی بلند قہقہہ لگاتا ہے جبکہ دیگر سوشل میڈیا کے کردار اس سے حسد کر کے آپس میں گفتگو کرتے اور منہ بناتے ہیں)

موبائل: تالیاں بجاتے ہوئے: ارے واہ......واہ...... بہت خوب...... میں یہی چاہتا تھا۔۔۔ کہ بطور خاص لوگوں کا شعور اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب کر لی جائے......

سیلفی: جناب والا! مجھے بھی لب کشائی کا موقع دیا جائے تاکہ میں دوسرے تمام نیٹ ورکس کی بولتی بند کرسکوں۔

چیٹ جی پی ٹی: میرے بعد اب کسی کو بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔

موبائل: نہیں نہیں سیلفی! میں تمھارے کارنامے سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوں۔

سیلفی اتراتے ہوئے: ویسے چیٹ جی پی ٹی نے خوب کہا کہ مجھے بولنے کی ضرورت نہیں...... کیونکہ میرا جادو خود ہی سر چڑھ کر بول رہا ہے...... کیونکہ ہر طرف میں ہی میں ہوں...... اٹھتے سیلفی...... سوتے سیلفی...... کھاتے سیلفی...... پیتے سیلفی...... آگے

سیلفی...... پیچھے سیلفی......
قہقہہ لگا کر...... میری سیلفیانہ اداوں کا تو ایک زمانہ معترف ہے...... میرے بغیر ہر تقریب ادھوری ہے۔۔
جو ہم نہ ہوں تو زمانے کی سانس رک جائے
سیلفی وقت کے سینے میں ہم دھڑکتے ہیں۔
جناب والا! آج میں نوجوان نسل کی پسندیدہ بن چکی ہوں۔ ان کے علم۔ اور ادب کو زنگ لگ چکا ہے...... وہ میری بدولت دکھاوا، بناوٹ اور شوخے پن جیسی عادات کو من و عن تسلیم کر چکے ہیں۔
کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمان جدید
ہے جہاد اس دور میں مرد مسلماں پر حرام
تمام درباری اونچا قہقہہ لگاتے ہیں۔۔ پیچھے خوفناک میوزک بلند ہوتا ہے۔
موبائل: شاباش...... میں خوش ہوں کہ نوجوان نسل کا بیڑہ غرق ہو چکا ہے...... اب دنیا کو ہم اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں...... ہاہاہا قہقہہ بلند کرتا ہے۔
اتنے میں پیچھے سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے۔
تمام کرداروں کا اچانک دم گھٹنے لگتا ہے کوئی تڑپ کر نیچے گرنے لگتا ہے کوئی قریب المرگ ہو جاتا ہے۔۔
کوئی کانوں پر ہاتھ رکھ کر ہوش کھو بیٹھتا ہے۔
ایک امید کی کرن آتی ہے جس کے ہاتھ میں قرآن اور تلوار ہوتی ہے۔
موبائل دم گھٹنے کے انداز میں رک رک کر کہتا ہے: یہ...... کک...... کک...... کون ہے...... جس نے...... ہمارا...... جج...... جینا عذاب...... کر دیا ہے......
امید کی کرن: وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذاں سے پیدا
مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
میری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی
(امید کی کرن کی آواز سن کر باقی کردار تھر تھر کانپنے لگتے ہیں)
امید کی کرن: میں وہ امید کی کرن ہوں جس کے بل بوتے پر آج بھی دنیا قائم ہے۔ جس کی وجہ سے آج بھی شرم و حیا، شرافت، کردار، اخلاق، اچھے اعمال باقی ہیں...... جب تک میری زندگی باقی ہے میں ان تمام کرداروں کے ارادے نیست و نابود کرتی رہوں گی۔۔
(تین بچے جن کے ٹیگ لگے ہوں گے اخلاق، شرافت اور ایمان آئیں گے اور نیچے گرے ہوئے سوشل میڈیا کے کرداروں پر سفید چادریں ڈال دیں گے)
پیچھے کلام اقبال کی آواز بلند ہوتی ہے اور پلے اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔۔

☆☆☆☆☆

”قبروں میں نہیں“ ”ان“ کو کتابوں میں اتارو“ (خاکہ)

نور کمال شاہ

یہ کوئی رومانیت بھری عشق کی داستان نہیں اور نہ ہی ہم یہاں نسوانی حسن اور اس کی سحر آگیں کشش کا کوئی قصہ دہرا رہے ہیں یہ کہانی ایک عاشق دل فگار کی تو ہے مگر ذرا الگ سے قسم کے عاشق کی جو کسی خیالی پری کی عطر بیز جوانی کا دیوانہ ہے نہ محبوب کی سرمئیں آنکھوں میں دلچسپی لیتا ہے کسی کی دراز مہکتی زلفوں کا اسیر ہے اور نہ ہی گلاب سے دہکتے گالوں کو دیکھنے اور چھونے کا آرزومند ہے ......!!!

میری اس داستان میں جس کبیدہ خاطر عاشق کا ذکر ہے اس کی معشوق کوئی نسوانی لیلیٰ نہیں بل کہ بولتی چالتی کتابیں ہیں- جی ہاں ! تنہائیاں بانٹتی، باتیں کرتی، نئی نویلی اور خوشبوئیں بکھیرتی کتابیں......

کیا آپ کسی ایسے شخص کا تصور کر سکتے ہیں جس کا سب سے قیمتی سرمایہ کتابیں ہوں: علمی، ادبی، اسلامی، سماجی و ثقافتی کتابیں اور وہ یہ سب کسی لائبریری سے اٹھا کر نہ لاتا ہو بل کہ اپنی قلیل سی حق حلال کی تنخواہ، جس میں تیس دن پورے کرنے کے لیے جانے کتنی خواہشات کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے اور کتنے ہی جگر سوز ارمانوں کو مانجے بٹھانا پڑتا ہے، میں سے ہر مہینے باقاعدہ ایک مقررہ حصہ الگ کر کے صرف اور صرف کتابوں کی خرید کے لیے مختص کر گیا ہو......

کسی نجومی کے حساب میں گڑبڑ ممکن ہے مگر اس اصول میں ہیرا پھیری ممکن نہیں......

موسمیات والوں کی پیشگوئی اور حساب کتاب میں کمی بیشی ہو سکتی ہے مگر یہاں بھول چوک محال ہے......

میں بچپن ہی سے ایک نہایت شوخ اور کھلنڈرے سے لڑکے کو اکثر گاؤں کے سامنے کھلے میدان اور محلے کے گلی کوچوں میں اتراتے ہوئے گھومتے پھرتے دیکھا کرتا تھا- سرخ و سفید اجلی رنگت، بے داغ لباس، خوب سجا سنورا اور اس کے سلیقے سے کنگھی کیے ہوئے ہیرو کٹ بال پیشانی کو ڈھکے ہوتے - یہ شوخ و شنگ لڑکا چھلاوے کی مانند کبھی گاؤں کے چھوٹے سے بازار میں گھومتے نظر آتا تو اگلے لمحے گاؤں کی تنگ گلی کوچوں کو پار کرتا ہوا ندیا کے پار کھیل کے میدان میں کبھی فٹ بال کی گیند کے پیچھے بھاگتا اور کبھی کرکٹ گیند کے پیچھے باؤنڈری لائن کی جانب دوڑ لگاتا دکھائی دیتا-

جوانی نے رنگ بدلا ! امنگوں نے ہیئت تبدیل کر لی تو تین چار ساتھیوں کے جلو میں ہیرو بن کر پھرنے والا لڑکا فرضی صنعت کار بن بیٹھا- جوتوں اور چپلوں کے مضبوط کاغذی ڈبوں سے دلکش ڈیزائن کے ٹرک اور بسیں بننے اور پگڈنڈیوں پر دوڑنے لگیں- اب منزل بدل گئی- گاؤں کی گلیوں اور گراؤنڈ سے اڑان بھرنے والی

شوق کی پرواز جوتوں اور کپڑوں کے دکان کے سامنے لینڈ کر گئی ۔ جوتوں کے خالی ڈبے اور کپڑے کی تھان کے گرد لپٹی کاغذ کی رنگین چلی تشہیری پٹیاں جمع ہونے لگیں ۔ گوند کی مدد سے خالی ڈبوں کو ٹرک یا بس کے ڈیزائن میں کاٹ کر مختلف ٹکڑے گوند کے ذریعے جوڑ دیئے جاتے اور اوپر کاغذ کی چمک دار شوخ پٹیاں جما کر نیچے ناقابل استعمال پھٹی پرانی ہوائی چپل سے بنے ٹائر لگا دیے جاتے : لیجئے جی گاڑی تیار ہے------!!!

وقت نے ایک اور پلٹا کھایا تو گاڑی سازی کو پس پشت ڈال کر کرکٹ کی ٹیم بنا ڈالی۔لڑکوں کو اکٹھا کر کے چندہ جمع کیا گیا اور صوابی سے اعلی درجے کی گیند، بلا، وکٹیں دستانوں سمیت پہنچ گئیں اور کھیل کے میدان آباد کر دیے مگر یہ شوق بھی جلد ہی مدھم پڑ گیا۔ اب صوابی اور مردان کے بک سٹالوں سے مختلف قسم کے رسالے اور فلمی کہانیوں کی کتابیں خرید کر جمع ہونے لگیں۔ یہ تمام قصے اس وقت کے ہیں جب موصوف باقاعدہ ہائی سکول طوطالئی کے طالب علم تھے اور آٹھویں سے دسویں جماعت کے درمیان تعلیمی سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ شعور بدلا، ذہن میں پختگی آ گئی تو فلمی رسالے اور کتابیں ٹارزن، عمرو عیار اور شیخ چلی کی کہانیوں پر مشتمل کتابوں میں بدل گئیں ۔ تعلیم و تربیت، نونہال اور چاند جیسے بچوں کے ماہوار رسالے ڈاک کے ذریعے گھر پہنچنے لگے ۔ کتابوں اور رسالوں کا روگ اس دن سے لے کر آج تک دل کو ایسا لگا ہوا ہے کہ چھٹائے نہیں چھوٹتا ۔ کتب و رسائل کی گنتی بڑھ گئی تو اپنے بیٹھک کی چھوٹی سی الماری سجا کے باقاعدہ پبلک لائبریری کا آغاز کر بیٹھے ۔ کتابیں تقسیم ہونے لگیں مگر جب کتابوں کے اجرا اور واپسی میں فرق خطرناک حدوں کو چھونے لگا تو اس کام سے بھی ہاتھ کھینچ لیا مگر کتابوں کی خریداری کا اصول حسب معمول جاری رہا۔

ذائقے مسلسل تغیر سے دوچار ہوتے رہے، پسند اور شوق کے زاویے تیزی سے بدلتے رہے شوق کے موضوعات سینما سکرین پر بدلتے مناظر کی طرح تیزی سے کتاب کے صفحوں کی مانند پلٹتے رہے۔فرق یہ پڑا کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا آغاز بھی کر بیٹھے۔ چھوٹی چھوٹی نگارشات اخبارات و رسائل میں چھپنے لگیں۔ "تعلیم و تربیت" کے لیے کہانیاں اور مضامین، فلمی رسالے "شمع" کے لیے افسانے اور "چاند" کے لیے طنزیہ و مزاحیہ تحریریں لکھ کر شائع کرائیں ان ہی دنوں تاش کے پتوں میں ایک اور رنگ کا اضافہ ہو گیا۔ جنگلی حیوانات اور پرندے دل کو بھا گئے اور ایسے بھائے کہ گاؤں میں واقع فارسٹ آفس کے چکر لگنے لگے۔ رینج افیسر سے دوستی گانٹھی گئی بعد میں مچھلیاں بھی اس فہرست میں شامل ہو گئیں۔ جنگلی حیات کی دلکش تصاویر، محکمے کے بنائے ہوئے رنگین پوسٹرز، معلوماتی کتابچے اور جنگلی حیات کی کہانیوں پر مبنی کتب و رسائل جمع ہونے لگے یہ معاملہ تب جا کر تھا جب صوبہ سرحد کے جنگلی حیات اور پرندوں پر کتاب لکھ کر شائع ہو گئی......

سیانے کہتے ہیں کہ قلم سے دوستی ہو جائے تو باقی تعلقات بہت پیچھے رہ جاتے ہیں موصوف نے قلم سے

تعلق کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اسے اس خوب صورتی سے نبھایا کہ پھر قلم ان کے ہاتھ سے کبھی چھوٹا ہی نہیں۔ قلم انگلیوں میں مسلسل ناچتا رہا؛ لفظ ان کے خیال کے اشارے پہ رقص کرتے رہے؛ تحریریں بنتی چلی گئیں اور کتابوں کی صورت میں ڈھلتی رہیں سیمابی فطرت نے کسی ایک زبان یا کسی ایک موضوع تک محدود رہنے ہی نہیں دیا۔ اردو میں لکھتے رہے؛ پشتو میں بھی بہت کچھ لکھا اور لکھنے لکھانے کا سلسلہ ہنوز زور وشور کے ساتھ جاری ہے اب تک مختلف موضوعات پر اردو اور پشتو زبان میں ان کی دو درجن کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور قلم میں روانی ابھی باقی ہے ----

گاؤں میں شیرین، سرکاری کاغذوں میں شیریں زادہ ادبی دنیا میں شیریں زادہ خدوخیل کے نام سے متعارف ہوئے۔ حلقہ احباب پورے پاکستان میں پھیلا ہوا ہے صوابی سے پشاور، پشاور سے اسلام آباد، وہاں سے لاہور اور کراچی تک اپنی ایک دنیا اور الگ پہچان بنا ڈالی۔ بچوں کی کہانیاں، افسانے، ناول، سفرنامے، سیرت پاک، تاریخ، اردو قواعد سبھی موضوعات پر طبع آزمائی کی اور علم وادب کا بہت سا ذخیرہ کتابوں کی صورت میں ادب کے دامن میں ڈال آئے کہ یہی ان کا کل اثاثہ تھا اور یہی عمر بھر کی جمع پونجی تھی۔ مختلف النوع حیثیتوں کو دیکھ کر میں اکثر سوچ میں پڑ جاتا ہوں جانے وہ کیا کیا ہیں اور ان تمام کمالات کو کس طرح ایک ساتھ چلاتے آ رہے ہیں اردو اور پشتو کے ادیب، تاریخ نگار، ناول نویس، افسانہ نگار، مزاح نگار، سیرت نویس، بہترین منتظم، محقق، ماہر تعلیم اور جانے کیا کیا۔

شیریں زادہ خدوخیل صاحب اصولوں کے پکے، قول کے سچے اور معاملات کے کھرے انسان ہیں شخصیت میں منافقت کا دوغلا پن بالکل بھی نہیں رکھتے اور یہی ان کی بڑی کمزوری ہے شاید یہی وجہ ہے کہ انہیں آج کے معاشرے میں پسندیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سچ بولنا اور حقیقت بیان کرنا ان کی کمزوریاں ہیں۔ ان کے بے رحم سچ کے سامنے اپنے پرائے اور دوست ومخالف سب بے بس رہتے ہیں۔ بے باک اور نڈر اتنے کہ نتائج کی پروا کیے بغیر معاملے میں کود پڑتے ہیں فقط اپنے من کی مانتے ہیں اور کسی بات پہ ڈٹ جائیں تو مجال ہے کہ کوئی انہیں ان کی موقف سے ہٹا سکے ہمدرد، مددگار اور کمزوروں کے حمایتی ہیں۔ بطور استاد اپنے شاگردوں کی علمی پیاس کو کامیابی سے بجھایا تو پرنسپل بن کر اپنے ادارے کی تعمیر وترقی میں دن رات ایک کیا دوستوں کے بہترین دوست ہیں تو مخالفین کے لیے وہ ایک ایسی کڑوی گولی کے مانند ہیں جسے نگلنا آسان نہ ہو بلا کے ہمدرد اور انتہا کے مددگار کہ جب دینے پہ آ جائیں تو اپنی ضروریات کو بھی فراموش کر بیٹھتے ہیں فیاض اتنے کہ ان کی ذاتی لائبریری سے سینکڑوں کتابیں بڑے بڑے اداروں کی لائبریریوں تک پہنچ جاتی ہیں مگر نمود ونمائش کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ آس پاس کے سکول، کالجز یہاں تک کہ صوابی کی یونیورسٹی بھی ان کی فیاضی سے مستفید ہو چکی ہے۔ شیریں زادہ خدوخیل صاحب ہمارے پختونخوا کا قیمتی اثاثہ ہیں مگر حسب دستور نظر انداز رہے ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی طرف توجہ دی جائے؛ ان کے علمی اور ادبی کارناموں کو سامنے لایا جائے تاکہ نئی نسل ان کے افکار سے مستفید ہو۔

☆☆☆☆☆

ہماری دادی

شاید لوگوں نے ان کی روشن اور گہری آنکھوں کو دیکھا ہے مگر میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھا ہے دادی حکمت، مصلحت، صبر وقناعت اور سادگی و محبت کی لازوال خوبیوں کا جیتا جاگتا پیکر ہیں اس کی آنکھیں برسوں کے تجربے اور گہرے جذبوں کی عکاسی کرتی ہیں وہ اکثر ماضی کی کہانیاں ہمیں سنا کر حیران کر دیتی ہیں جس میں صبر، نیکی اور ہمدردی کے اسباق کو بنتی ہے۔ دادی ایک مخلص خاتون جس کی دامن میں تو بہت کچھ نہیں مگر جتنا ہے اپنا اور فطری ہے، مالی حیثیت، سرکاری عہدہ اور عوامی شہرت تو نہیں لیکن ان کی حیران کر دینے والی شفقت، ہمدردی اور دوسروں کے بارے میں خوش نیتی ان کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ نوجوانی میں اگرچہ وہ خوب صورت اور پرکشش خاتون تھی لیکن انھوں نے خاندانی روایات اور بزرگوں کی عزت کا پاس رکھتے ہوئے خود کو ہر طرح کے امتحان کے لیے تیار رکھا نوجوانی کی زندگی فقر اور محدود وسائل میں گزری جس میں اشد ضروریات بھی پوری نہ ہوسکی مگر پھر بھی زندگی کا وہ سخت اور کٹھن لمحات نہایت صبر وشکر اور امید کے ساتھ بسر کی، ناسائند حالات کے باوجود ان کے لبوں پر کبھی شکوہ اور گلہ نہیں دیکھا پتہ نہیں یہ تمام اوصاف رسمی تعلیم سے بے بہرہ خاتون میں کہاں سے آئیں۔ نہایت سوجھ بوجھ کی حامل جو کسی عام کتاب کی خواندہ نہیں تھیں لیکن کتاب زندگی کی پیرو تھیں۔

ہماری دادی جان ''زاہدہ بی بی'' جو اپنے خاندان میں معصومیت، سادگی کی وجہ سے ''وڑہ'' یعنی کم سن یا چھوٹی کے نام سے پکاری جاتی تھی اس نام سے ان کو ایک فائدہ بھی تھا کہ چھوٹی کا لقب انھیں خاندان کے ہر آدمی سے مہربانی اور پیار کا مستحق بنا دیتا تھا زاہدہ بی بی عرف ''وڑہ'' جنھیں ان کے سارے پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں دادی (بے بے) کہا کرتے ہیں۔ دادی ضلع مردان کے نواحی علاقے گاؤں گدر میں پیدا ہوئیں اللہ تبارک تعالیٰ نے دادی کو اولاد فراوانی سے عطا کی ان کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں اپنے انتہائی محدود وسائل کے باوجود اپنے بیٹوں کو بنیادی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا، ان کا بچپن اور جوانی مٹی کے کچے گھروں، سادہ خوراک ولباس اور ہر دن تہوار کے مزے لیتے

نوید عائل

گزری۔ دادی کی تربیت اور زندگی کے سادہ اصولوں کے بنا پر ان کے تمام بچوں نے اور ان کے بچوں نے ذمہ داریوں کا احساس کیا اور بساط بھر اپنے والدین کا ہاتھ بٹایا، اپنے بچوں کو خودداری و خود اعتمادی کا ایسا درس دیا کہ ان کی بچوں نے اتنی محنت اور لگن سے کام کیا کہ زندگی کا سارا نقشہ تبدیل ہو گیا اور زندگی میں کچھ سکون و آرام کا راستہ ہموار ہو گیا۔ زندگی کا نقشہ تبدیل ہونے پر طویل علالت کے بعد ان کا شوہر وفات پا گیا ان کی شوہر کا حوصلہ بھی پہاڑ سے کم نہ تھا، علاوہ ازیں بھی ان کی زندگی میں اور مسائل اور تکالیف آئے مگر اس کے باوجود ہمارے لیے روایتی دادیوں کی طرح کہانیوں اور مزیدار واقعات سے مزین تھا ان کا ہونا ہمارے لیے حاقت کا ستون اور باعث افتخار ہیں۔ ان کے ہاتھ اگر چہ بوڑھے ہوئے ہیں مگر پھر بھی خوبصورتی پیدا کرنے کے قابل ہیں، ان کے اندر سلیقہ مندی اور ہنر آج بھی ایسا ہے کہ گھر میں تمام برکت اور خوشحالی ان کے ہاتھوں کا کرشمہ ہیں۔

دادی کی شخصیت بمثل آئینہ ہیں ان کا چہرہ ان کے اندرونی اتار چڑھاؤ کا بہت بڑا عکاس ہے اگر خوش ہیں تو چہرہ اور آنکھیں مسکرا رہی ہیں اگر ناراض ہیں تو ایک تحکم ان کے چہرے پر اور گرج ان کے لہجے میں۔۔۔ بولتے وقت ان کی آواز میں مردانہ تاثیر پائی جاتی ہے وہ بھی شاید اس لیے کہ انھوں نے اپنی اور ہماری بقا اور خوشحالی کے لیے مردانہ وار جدوجہد کی ہے۔ دادی ہمیشہ غیر ذمہ دارانہ حرکت و عمل پر غصہ کرتی ہیں مگر یہ غصہ بھی بمثل ابر ہی ہوتا ہے جیسے آتا ہے ویسے ہی چلا جاتا ہے۔ ان کا وجود ہمارے پورے خاندان کی یکجائی کا باعث ہیں آپ کی شخصیت ایسی مرکزی حیثیت اختیار کر چکی ہیں کہ 45 افراد پر مشتمل خاندان جو ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے ہیں اور تمام کے تمام دادی کے حکم کے تابع ہیں، دادی کے بعد گھر کا بڑا سربراہ ان کا بڑا بیٹا (محمد جان) اور میرا والد محترم سے لے کر گھر کے آخری فرد تک تمام کے تمام گھر سے باہر نکلنے سے پہلے اور گھر آنے کے بعد ان کے سامنے حاضری ضرور لگواتے ہیں اور ان سے ڈھیر سارے پرخلوص دعائیں حاصل کرتے ہیں۔

دادی انتہائی عقلمند اور تجربہ کار خاتون ہیں کبھی کبھار میں تردد کا شکار ہو جاتا ہوں کہ ایک ان پڑھ خاتون جو صرف قرآن پڑھنا جانتی ہو بغیر کسی رسمی تعلیم کے زندگی گزارنے کا ایسا طریقہ، ڈھپ، ڈھنگ اور روش جانتی ہے کہ ہر روپ سروپ میں کامل۔۔۔ بیٹوں سے کیسے مخاطب ہونا ہے، داماد وں کو کتنی عزت دینی ہے، سسرالیوں کا اکرام کس انداز سے کرنا ہے، پرانے ہمسائے آئیں تو کیسے عزت دیتی ہیں ان تمام امور پر اس قدر قدرت حاصل ہے کہ آج کی پڑھی لکھی خواتین شائد ان سے شناسا بھی نہ ہوں۔ خدا نے انھیں تقریباً 30 پوتے پوتیوں سے نوازا ہے جن کے لیے ہمہ وقت فرداً فرداً ہر ایک کے لیے فکر مند رہتی ہیں ایک ایک کے بارے میں معلومات کرنا، ان کی روٹی سے لے کر سکول، کالج اور یونی ورسٹی تک خود کو باخبر رکھنا، ان میں کسی کو بھی تکلیف اور بیماری ہوں تو ان کے لیے حد سے زیادہ پریشان ہونا اور راتوں کو اٹھ کر تہجد کرنے

کے بعد گھر کے دالان میں کھلے آسمان کے نیچے کھڑی ہو کر اپنی دامن اور ڈوپٹہ خدا کے سامنے پھیلا کر ان کے لیے اچھی صحت، اچھی زندگی اور امن میں رہنے کے لیے دعائیں کرنا ان کا معمول ہیں۔ پورے علاقے میں اتنا بڑا گھر اور خاندان جو ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے ہیں کسی کا نہیں مگر یہ کرشمہ میری دادی کا ہے۔ وہ اپنے تمام پوتوں پوتیوں پر مہربان ہوا کرتی ہیں مگر اپنے بڑے بیٹے کے بیٹوں یعنی ہمارے بھائیوں سے ان کی محبت اور اکرام سب سے زیادہ --- زندگی میں اگرچہ انھیں بے شمار دکھوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان صدمات کو اپنی ذات کے ایک مخصوص اور مضبوط خول میں چھپا کر ہمارے لیے ہماری شفیق اور مہربان ہی رہتی ہیں، محبت اور شفقت کا پیکر، جلال و جمال کا ایک حسین امتزاج، ہماری شرارتوں پر برہم اور اگلے لمحے موم سی مسکراہٹ ... وہ انتہائی مضبوط اعصاب رکھنے والی خاتون ہیں کبھی ان کی زبان یہ نہیں سنا کہ میں بہت بیمار ہوں مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو ہم زبردستی انھیں ڈاکٹرز کے پاس لے چلتے ہیں۔ ایک مرتبہ فالج نے اٹیک کیا مگر ان کی اعصاب اس پر حاوی رہی اور جلد اس سے صحت یاب ہوئی، پھر ان کے جسم میں 14 کلو رسولی مگر انھوں نے کبھی فریاد نہیں کی حالانکہ رسولی کا درد کتنا غضب ناک ہوتا ہے خدا اس سے ہر کوئی بچا کے رکھے جب انھیں آپریشن کے لیے ہسپتال لے گئے تو آپریشن سے قبل ڈاکٹرز دستخط لیتے ہیں مگر ان کا ایک بیٹا جاوید خان جو دادی سے بے حد محبت کرتا ہے جس کی انتہا نہیں --- تو دستخط کرنے سے قبل جاوید خان نے ڈاکٹرز کو بھاری آواز میں کہا ''میں اپنی ماں تم کو زندہ اور سلامت حوالہ کر رہا ہوں اسی طرح مجھے زندہ اور سلامت دوں گے اور اس کے لیے دستخط تم کروں گے'' جس پر ڈاکٹرز پریشان ہوئے مگر دادی کے اعصاب اور حوصلے نے ڈاکٹرز کو بھی مطمئن کر دیا۔ اب ان کی زندگی اپنی تمام خاندان کی خوشیوں کے لیے وقف ہیں اب اس کی زندگی کا مقصد اپنے بیٹوں، پوتوں اور نواسوں کو ڈھیر ساری دعائیں دینی ہیں... آپ نے ہم سب کو بے پناہ محبت، شفقت، مستقبل میں اپنی منزل تک پہنچنے کی امید اور اس سے بڑھ کر ماضی سے ایک مضبوط ناطہ دیا ہیں جو ہماری ذہنوں پر نقش ہیں۔ ہماری دادی ایک ایسی تہذیب و ثقافت کی پابند ہے جو اب حال حال اس معاشرے میں نظر آتی ہے بغیر کسی تعصب اور خاندانی غرور کے تمام لوگوں کو اپنے اخلاص سے خوش رکھنا ان کا ہنر ہے، اپنی سادگی اور نیک نیتی کے باعث انھیں یہ پتہ ہی نہیں کہ ہمارے معاشرے میں اب لوگ دوسروں کو کم تر اور محروم رکھنے کے کون کون سے حربے استعمال کرتے ہیں میں انھیں خوش قسمت ترین شخصیت سمجھتا ہوں کہ جتنا جانتی ہیں اتنا انھیں مطمئن اور خوش رکھنے کے لیے کافی ہے اور اسی متاع حیات کی وجہ سے قائم اور دائم ہیں۔

ہمارے گھر کے رازدانوں سے اگرچہ کھنڈرات کا کوئی خزانہ تو نہ ملا مگر ان قیمتی خزانوں سے بھی قیمتی گنج ہمیں دادی کی صورت میں نصیب ہوا۔ اللہ تعالیٰ انھیں برکت والی زندگی عطا کرے۔ آمین

☆☆☆☆☆

شاعر صادق، عرفان صادق (عرف) بلونت سنگھ حافظ آبادی

عرفان صادق تاریخ پیدائش کے حوالے سے مجھ سے تین دن بڑا ہے ویسے سال پیدائش دیکھیں تو یہ مجھ سے تقریباً 12 سال چھوٹا ہے اُسی لیے میں اس کا بس اتنا ہی احترام کرتا ہوں، جتنا دسترخوان پر لوگ بڑے پائے کا احترام کرتے ہیں مگر یہ سچ ہے میں اس سے پیار بہت کرتا ہوں کے آخر یہ مجھ سے 12 سال چھوٹا ہے، سو میں عرفان صادق سے احترام کم اور پیار محبت زیادہ والے معاملے میں مبتلا ہوں اور جہاں پیار ہو وہاں تو میں کہہ سکتا ہوں اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ:

جس کا آغاز ہی محبت ہو
اس کا انجام سوچتا ہوں میں

....

بیشک آپ اس شعر پر داد دیں کے یہ عرفان صادق کا شعر نہیں ہے میرا شعر ہے۔

عرفان صادق اگر ضیاالحق کے مارشل لائی دور میں باقائمی ہوش وحواس شاعری کر رہا ہوتا تو اس کا نام عرفان حافظ آبادی ہوتا اور یہ سر پر ٹوپی رکھے نعت شریف پڑھ کر روزی کما رہا ہوتا ہے۔ پیپلز پارٹی کے دوسرے دور جدید کا شاعر ہوتا تو اس کا نام سردار عرفان بلونت سنگھ ہوتا، اور یہ پیپلز پارٹی کا نہ صرف سرکردہ لیڈر ہوتا بل کہ آخری پوڑی پر کھڑا ترقی پسند بھی ہوتا مگر رب سخن کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے

اعجاز رضوی

آسان ترین دور میں شاعری شروع کی، اور آسان ترین انٹرنیٹ شارٹ کٹ سے پوری دنیا میں مشہور ہوا، اور بطور ماسٹر عرفان دین سپیکر ان لوگوں کو بھی اردو شاعری پڑھا دی جن کے باپ دادا بھی اردو سے واقف نہیں تھے۔

عرفان صادق نے کچی عمر میں پکے پن کے ساتھ لاہور دیکھا، سڑکوں سڑکوں گھوما کتابوں کی دکان سے خریداری کی پسندیدہ کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے واپس حافظ آباد چلا گیا، مگر لاہوری شعرا سے اتنا متاثر ہوا کہ کچھ عرصہ بعد پورے کا پورا لاہور منتقل ہو گیا۔ اور یہاں آ کر اس نے پبلی کیشنز کو باقاعدہ پیشہ بنایا، اور اپنے ادارے کا نام سیوا پبلی کیشنز رکھا اور بیرون ملک شعرا کی ایسی ایسی سیوا کی کہ اس کے سیوا کی دور دور تک دھوم مچ گئی اور اسی دھوم مچائی کے دوران اس نے جلدی جلدی ہندوستان فرانس، بیلجیم، سویڈن، ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ اور شارجہ گھوم لیا، مگر لاہور سے صادق آباد مشاعرے میں جاتے ہوئے ویرانے کو یوں دیکھتا رہا جیسے اپنا گاؤں ڈھونڈ رہا ہو، عرفان صادق کے دل میں گاؤں ابھی تک زندہ ہے، اس کی گفتگو میں گاؤں نظر آتا ہے بھائی کہہ کر مخاطب کرنا، اور پھر بات کرتے کرتے یوں یکدم منہ بنا لینا جیسے آس پاس سے بو آ رہی ہو، اس کی خاص عادت ہے۔ 1990 سے اب تک اس نے لاکھوں نہیں ہزاروں نہیں سینکڑوں نہیں بس چند اچھے مشاعرے پڑھے ہیں۔ جب یہ مشاعرہ پڑھنے اُٹھتا ہے تو لگتا ہے کشتی لڑنے جا رہا ہے۔

عرفان صادق کو پروفیسرز والا کالا گون پہنا دیا جائے تو یہ پروفیسر سے زیادہ باکسر لگتا ہے، ایک بار اس نے اپنے اندر کے باکسر کو آن پریکٹس ریڈیو پاکستان کے رنگ میں اتارا تھا، اور ایک شاعر کو ایسا پنچ مارا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا، کچھ دیر بعد خود عرفان صادق نے ہی اپنے دونوں پنج ملا کر معافی بھی مانگ لی، یوں معاملہ رفع دفع ہو گیا، ورنہ آج ہم جس شاعر کو سینئر کہہ کر صدارت رکھواتے ہیں اس کی برسی منا رہے ہوتے، عرفان صادق کے چلنے کا انداز کچی مٹی پر چلنے والا ہے یہ بہت سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہے اور رکھتا ہے، گردن کچھ اوپر کی طرف رکھتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے کسی کو اشارہ کرنے والا ہے۔ یہ عام طور پر شلوار قمیض پہنتا ہے مگر خاص خاص موقعوں پر جہاں اس کو رعب ڈالنا مقصود ہو، وہاں پینٹ شرٹ بھی پہن لیتا ہے۔ ایسی صورت میں

اس کے سامنے کے بٹن کھلے ہوتے ہیں کہ اس کا پیٹ دو طرفہ صلح صفائی کے لیے ہر وقت موجود ہوتا ہے یہ شیو خوب جما کر کرتا ہے۔ لوگ اس کی ٹنڈ کو بھی شیو کا رقبہ سمجھتے ہیں۔ یہ جب بھی موسم کے لحاظ سے گردن یا کاندھے پر گرم چادر ڈال کر نکلتا ہے تو لگتا ہے کوئی کلاسیکل فنکار روٹی کمانے جا رہا ہو۔ عرفان صادق مسکرانے کا قائل نہیں یہ قہقہہ لگاتا ہے۔ اور اس حالت میں یہ کرسی کی آخری حد تک گردن کو لے جاتا ہے اور پھر یوں گردن آگے لاتا ہے جیسے سامنے والے کو ٹکر مارنے والا ہو، اس کی گاڑی کے اندر کتابیں ہوتی ہیں اور ڈکی میں بھی کتابیں ہوتی ہیں۔ مگر یہ کتابیں صرف اس کی ہی ہوتی ہیں کسی اور کا مجموعہ اپنی گاڑی میں رکھنا اس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں۔

اس کی شاعری میں رومانیت کا غلبہ ہے ہر دو چار مصرعوں کے بعد ضرور با ضرور رومانیت کی فضا نظر آنے لگتی ہے۔ یہ کہتا ہے:

عشق کا کھیل مکمل بھی تو ہو سکتا ہے
دل اُسے دیکھ کے پاگل بھی تو ہو سکتا ہے

ہاں کسی وقت بھی رک سکتی ہیں چلتی سانسیں
میری آنکھوں سے وہ اوجھل بھی تو ہو سکتا ہے
ہاتھوں میں ڈالے ہاتھ بہت دور تک گیا
میں روشنی کے ساتھ بہت دور تک گیا

ایک دن یہ شعر سن کر روشنی کے باپ نے اس کو پکڑ لیا تھا اور پوچھا تھا کہ دس کنی دور تک گیا سی، نالے پہلوان روشنی دی انگوٹھی واپس کر، جیہڑی تو رعب پا کے لائی سی، اسی طرح کوئی دوشیزہ یا تین شیزہ اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرے اور یہ اُن کو بلا بھی لے تو وہ اس سے ملتے ہوئے کہتی ہیں ہائے ہم تو رومانی شاعر عرفان صادق سے ملنے آئے تھے مگر ملاقات تو اس کے مرثیہ نگار ابا جی سے ہو گئی۔ عرفان صادق اپنی ذات میں کشش پیدا کرنے کے لیے سیوا چلی کیشنز کے چیئرمین کا لفظ بھی اپنے ساتھ لگایا ہوا ہے کہ اس کا ادارہ اپنے وقت کا قانونی سند یافتہ ادارہ ہے، جس کا ہر عہدہ چیئرمین سمیت خود عرفان صادق کے پاس ہے، یہ اپنے دفتر میں دست بستہ کھڑا ہو کر خود کو مخاطب کرتا ہے سر کوئی حکم پھر خود ہی کرسی پر بیٹھ کر کہتا ہے جاؤ دو کپ چائے لاؤ، مہمان آئے ہیں پھر جلدی سے خود ہی اٹھ کر چائے لے آتا ہے۔ اس کا کہنا ہے اعجاز بھائی کم خود کر لینا چاہی دا اے کسی دوجے دا محتاج نہیں ہونا چاہیدا۔

عرفان صادق اعلانیہ ترقی پسند شاعر نہیں،

اس کی شاعری سے کہیں کہیں ترقی پسندی جھڑتی ہے، مگر ترقی پسند مصنفین سے اس کی دوستی بہت جمتی ہے، وہ بھی اس لیے کہ مصنفین سے اس کا کوئی کوئی جھگڑا نہیں، اس کا جھگڑا تو شاعروں سے ہے اس لیے یہ اس وقت تک ترقی پسندوں میں کامیاب و کامران رہے گا جب تک انجمن ترقی پسند شعرا نہیں بن جاتی، جس دن انجمن ترقی پسند شعرا وجود میں آئے گی اس دن یہ کھلے دل سے ہر ترقی پسند کو کنونس کرے گا اور کہے گا کہ بن مینوں چیئرمین بنا دیو اگر بات مان لی گئی تو بسم اللہ ورنہ تسی کون تے میں کون۔

عرفان صادق دنیا کا واحد شاعر ہے، جو رشتہ اور رشتے داری۔ صرف شعر و ادب کے حوالے کرتا ہے اور اُسی کو صحیح سمجھتا ہے منتخب کلام ابد آباد میں آرا کی ترتیب دیکھیں۔ احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، ظفر اقبال، جیلانی کامران، خورشید رضوی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، مرتضیٰ برلاس، شہزاد احمد اور پھر ہمارے بیچارے اکیلے نذیر قیصر کی رائے پر غور کریں جو کہتے ہیں کہ عرفان صادق نے ہمارے خالی پن کو محبت سے بھر دیا ہے، ہمیں اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

یقیناً نذیر قیصر نے صحیح کہا ہے کہ ہمارے خالی پن کو محبت سے بھر دیا ہے، مگر نذیر قیصر نے خود آج تک یہ نہیں سوچا کہ خالی پن پیدا ہونے کی اصل وجہ نظریے کا نہ ہونا ہے۔

یہ بات نذیر قیصر سمیت تمام شعرا کو سوچنی چاہیے کہ محبت کی شاعری کرنے والوں کا بھی ایک نظریہ ہوتا ہے، اور محبت کا محور و مرکز بھی کوئی شخصیت، کوئی نظریہ کوئی قول کوئی فعل کوئی اکڑ تو ضرور ہوتی ہے۔ صرف فضا میں گل بوٹے گاڑھنے سے فضا خوشگوار نہیں بنتی، اس کے لیے اپنے لہو کا ائر فریشنر استعمال کرنا پڑتا ہے، عرفان صادق نے دو مختلف خیالات رکھنے والے مختلف نظریہ حیات اور مختلف نظریہ ادب رکھنے والوں سے جو کچھ اپنے بارے میں سن لیا وہ سچ ہے، مگر پھر خدائے سخن کا لاکھ لاکھ شکر ہے تمام تر آرا کے باوجود عرفان صادق نے جو سوچا، جو محسوس کیا وہی لکھا، وہ غزلیں ہوں، نظمیں ہوں، یا بولیاں، سب میں عرفان صادق نظر آتا ہے۔ اور جو شخص اپنی تحریر یا اپنے اشعار میں نظر آ جائے اس شخص سے زیادہ کوئی شے اہم نہیں، سو میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ عرفان صادق، اہم ہے اور اہم رہے گا، کیونکہ یہ پکڑ دھکڑ کرنے والا شاعر نہیں بل کہ قاری کو پکڑ کر رکھنے والا سچا سیدھا اور اہم شاعر ہے اور شاعر ہونا ایک اعزاز ہے جو عرفان صادق ہے۔

☆☆☆☆☆

دانشِ مجہول (اہلِ غزہ کے لیے)

قول اپنی عمومیت میں کئی
بے مثال و عظیم لگتے ہیں
پر زمینی حقیقتیں دیکھیں
تو یہ کھلتا ہے
ہر صداقت کا
ایک اپنا سیاق ہوتا ہے
موسمِ وحش و بربریت میں
مجرمانہ خموشیاں جیتے
اہلِ حرف و بیاں کی
ترجیحیں!
کم کوئی سنگریزۂ اظہار
فرقِ غارت گراں نشانہ کرے
پر بموں سے
بچے کھچے بچے
خیمہ زن
بستیوں کے ملبوں پر
کبھی غصے میں
راکٹوں کی طرف
پھینک دیں
کچھ غلیل سے پتھر
اُن سے کہنا کہ
جنگ اچھی نہیں
کوئی شک ہے
کہ بات سچی نہیں

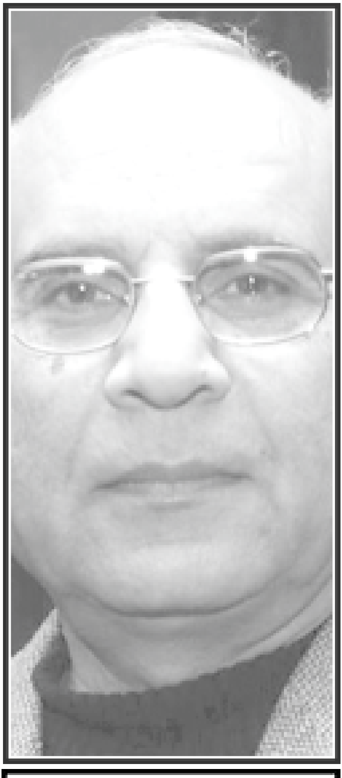

جلیل عالی

دِل کی دیوی کے لیے

تُم،
کہ جس سے مِرا
کوئی رشتہ نہیں، کوئی ناتا نہیں!
جانے کیوں مجھ کو یوں لگ رہا ہے
تمہارے سِوا
ساری دُنیا میں
میرا کسی سے بھی اب
کوئی رشتہ نہیں،
کوئی ناتا نہیں!

میرے لیے

میرے مالک،
مری بس ایک دُعا، ایک دُعا
اُس کی آنکھوں میں محبت کے
دِیے جلتے ہوں
اور وُہ
میرے لیے، میرے لیے جلتے ہوں!!

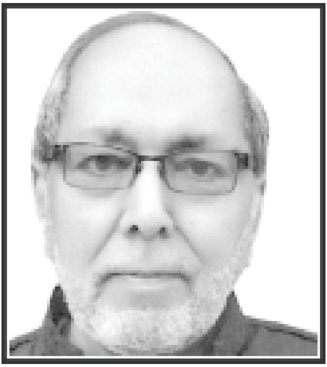

نسیم سحر

انتخاب
خالد احمد
نعمان منظور

ہر قدم گوش بر آواز پھرے ہیں خالد
ہم نے جی بھر کے سنا، پختہ گھروں کا رونا

زمین کی کھینچ

شیشہ پھول کہاں کھلتے ہیں؟
سونا گھاس کہاں اُگتی ہے؟
بادل، ندی، برف سے ہٹ کر
پانی کا کچھ شغل الگ ہے؟
خاموشی اور شور کی دونوں حد سے آگے
کیا آواز کا چہرہ کوئی اور بھی ہوگا؟
سات سُروں، انیس مروّج بحروں سے
آگے کیا دیکھا تم نے؟
اوس کے قطرے کن لفظوں میں
ڈیزی سے باتیں کرتے ہیں؟
پتھر رقص کہاں کرتے ہیں؟
دھوپ کے پھول
زمیں سے آگے
اور کہاں تک گرتے ہیں؟

ہم مٹی پہ چلنے والے
کچی پکی اینٹوں سے گھر کی دیوار اٹھانے والے
تھوڑی دیر ہی اُڑ سکتے ہیں
تھوڑی دور ہی جا پاتے ہیں۔
کہتے ہیں مریخ پہ سورج
ڈوبتے ڈوبتے
نیلے رنگ کا ہو جاتا ہے۔

منظر اعجاز منظر

شاعری (نظم)

منقسم خیالوں میں
بے سبب گمانوں میں
جب الجھ کے رہ جائیں
نظم کیسے ہوتی ہے
شعر کب اترتا ہے
بے یقیں خلاؤں میں
روز و شب گزرتے ہوں
فرش پر خلاؤں کے
خوف اوڑھے چلتے ہوں
روز و شب خیالوں میں
وسوسوں، صداؤں کے
خواب سے اترتے ہوں
وقت کی بلاؤں سے
جان و دل لرزتے ہوں
شور و شر کی رگ رگ میں
آندھیاں سی چلتی ہوں
نظم کیسے ہوتی ہے
شعر کب اترتا ہے
آسماں زمیں جب بھی
چاک فن پہ آ جائیں
دل میں رکھی سب شکلیں
چاندی سی نکھر جائیں
آتشِ جنوں سے جب
سوچ کچھ پگھل جائے
جب لگے کہ ہاتھوں کو
اک ذرا بڑھا کے میں
عرش تک کو چھو لوں گا
جب لگے کہ دستک سے
سارے بند دروازے
خود پہ آج کھولوں گا
جب لگے کہ پاؤں بھی
اس گھڑی سے آ گئے ہیں
جس میں جی رہا ہوں میں
شعر پھر اترتا ہے
اور نظم ہوتی ہے

سلیم فگار

کوہِ مقدس

غار خاموش پڑا ہے
کوئی آواز نہیں
میں نے چالیس دنوں سے
تجھے دیکھا نہیں ہے
جو مرے ساتھ تھے
دریا کے کنارے پر ہیں
میں انہیں چھوڑ کے مشرق کی طرف آیا ہوں
تاکہ کچھ بات کروں
از سرِ نو عہد کروں
اب یہاں کوئی نہیں تیرے سوا
میرے سوا
بات کر،
دیکھ!! مری عمر کے کمزور نقوش
ان میں قوت نہیں
برداشت نہیں
رنگ نہیں
تو مرے ساتھ ہے یہ تو نے کہا تھا
اور اب
میں
یہاں کوہِ مقدس پہ ہوں
آواز
تو سن!!!
مجھ کو محسوس تو ہو
دیکھنے والا
تو ہے۔۔۔
اک صدا،
گونج،
مرے جیسی ہی تصویر ہوئی
لب ملے
اور کہا اے مرے ہمراز بدن
جلد بازی سے محبت نہیں
دکھ ملتا ہے

عماد اظہر

نوٹوں کے درخت

سر سبز کالونی کا خاموش چاند
سیاہی مائل فلک پہ چسپاں
سر سبز کالونی کے دھیمی روشنی کے میدان
میدان میں بلے بازلڑ کے
اور مہنگی حسرتوں کوانگلیوں پہ گنتا باپ
بظاہر واک کرتا ہے
درختوں کے پتوں میں سرسراتی ہوا
سبزے کی مہک
ہاں اچھی ہے
مگر زیادہ اچھی ہے
بوگاٹی ٗ مرسیڈیز؛ شیرون ٗ چیکنی
چھوٹے کچن میں چائے کی گرم کیتلی
زندگی ہے
پر مسائل کی آنچ میں پانی ابل کر کناروں
سے نکل جاتا ہے
چائے بے ذائقہ ہے
درختوں پہ نوٹوں کی گیم اپریٹ کرتے
بچوں کو چوم کر
ماں نے اشک چادر میں چھپائے
فرزند کا واک کے پسینے سے چمکتا ماتھا
بھی چوما
میرے چاند سر سبز کالونی کے سارے
درختوں کے
سارے پتوں جتنے نوٹ ترے پاس ہوں
تری انگلیوں کے پوروں پہ گنے ترے
سپنے سچ ہوں
میں جیتی آنکھوں سے دیکھ لوں
اور اب
ماں کی آنکھیں جیتی ہیں مگر دیکھ نہیں سکتی
اشکوں سے معمور بے نور آنکھیں
جن کے لیے کرتہ یوسف نہیں

درِدانہ نوشین خان

کتھا کہانی

اِک پردہ سا آنکھوں پر تھا
بچپن کی گلیوں کے سائے آنے والا ایک مداری
بائیسکوپ سے جادونگری دِکھلاتا تھا
بچوں کی اس فوج میں
میرے ہاتھ کی ننھی دہلیزوں پر
سات زمانے اُترے تھے!
دو پیسے کا سکّہ دے کر
قطب کی لاٹھ کی چوٹی دیکھی
چرخا کاتتی چاند پہ بڑھیا
جھانسی کی رانی کے اندر
زِرہ پہنے ہوئے تھی گڑیا
گنگا جمنا کے دھارے تھے
ہر سُو لگے ہوئے تارے تھے
سات سمندر پار جزیرے
پانی میں موتی اور ہیرے
جانے کیا کیا دیکھ لیا تھا
آج اِک عمر بتا کر اپنی کتھا کہانی سوچ رہی ہوں
وقت کے بائیسکوپ میں دُنیا
کتنے رنگ گزار چکی ہے
ماضی کے پردے پر پھیلے
پیار اور نفرت
دُکھ اور راحت کے مابین
اِک کھیل جما ہے
جیون کا پنڈال سجا ہے!
بچپن کی گلیوں کے سائے، آنے والا ایک مداری
دو پیسے کا سکّہ لے کر جادونگری دِکھلاتا تھا
لیکن میں نے اِس جیون کو
جانے کیا کچھ دے ڈالا ہے

رخشندہ نوید

سچے سُر

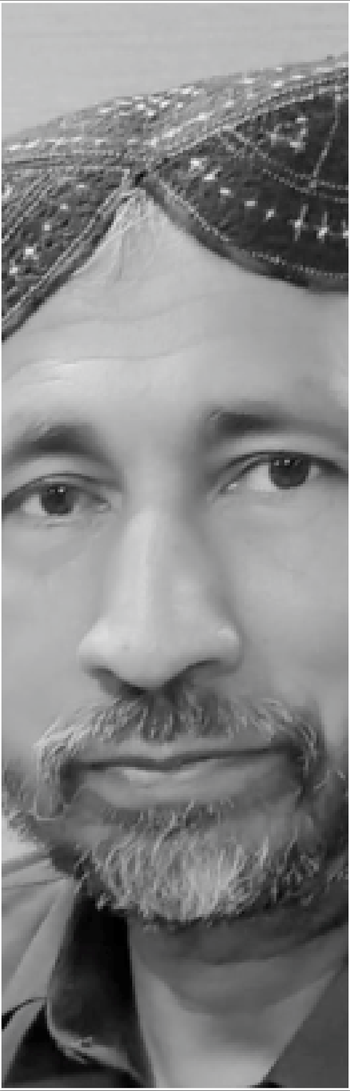

کوئی ایسا گیت سنائے

جس کو سُن کر پتھر رو دیں

بہتا وقت رک جائے

بیتی یادیں بچھڑے چہرے

بھولی باتیں ٹوٹے سپنے

سب ہی یاد آ جائے

بول ہوں جس کے درد میں ڈوبے

ہر اک لفظ یوں دل میں اترے

من میں آگ لگائے

ایسے سچے سُر ہوں جس کے

رقص کریں یوں دل کے جذبے

دھڑکن بھی رک جائے

کوئی ایسا گیت سنائے

ریاض ندیم نیازی

نثری نظم

حساسیت اور دکھ کا سمبندھ گہرا ہوتا ہے"

حساسیت اور دکھ کا سمبندھ بہت
گہرا ہے
ذرا سی بات بھی بڑی لگتی ہے
لہجوں کے زخم بھر نہیں پاتے

محبت اداسی سے مقسوم ہے
درد دل پہ دستک دیتا ہے
کوئی ستارا پلکوں سے ٹوٹ کر
قدموں میں گرا تھا
تمھارے آنکھ میں میرا آنسو لو دیتا ہے

خواب کی زندگی مختصر ہوتی ہے
آنکھ کھلتے ہی منظر دھندلا جاتا ہے
زندگی ادھوری لگتی ہے
ساتھ پل بھر کا ہو یا عمر بھر کر
ہاتھ چھٹنے سے درد تو ہوتا ہے
تھامنے والا ہاتھ نہ ہو گزرے پل تو سنگ رہتے ہیں

اداسی کی انگلی تھامے
یادوں کی ڈگر پر چلتے رہتے ہیں
حساسیت روح کو ڈھانپ لیتی ہے
لہجے کی گیلاہٹ اور آنکھوں کی نمی
بڑھنے والے فاصلوں سے مستعار لی تھی

اب وہاں سے گلاب نہیں آتے
دل کا آنگن سونا رہتا ہے
تنہائی دیواروں سے لپٹ کر بے آواز روتی ہے
من کے بھیتر واپس نہ آنے والوں کی یاد
بین کرتی ہے
جدا ابدی حقیقت سہی
حساسیت اور دکھ کا سمبندھ گہرا ہے

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مَرنے کے بھی ان گنت بہانے
جینے کو بھی لاکھ مسئلے ہیں

"اضطراب"

حسین چہرہ، دراز قامت، غزال آنکھیں، کمال لڑکی
رسیلے ہونٹوں کو وا کرے تو
دلوں کو کردے نہال لڑکی
یہ دل کبوتر
ازل کا گھائل
نہ ڈال زلفوں کے جال لڑکی
تُو اپسرا ہے
تُو گُل بدن ہے
تُو نازنیں ہے
میں مانتا ہوں
تری طلب میں
ہزار دل یوں تو فرشِ رہ ہیں
میں جانتا ہوں
تمھارے ابرو کے اک اشارے پہ
سو جبینیں ہوں سجدہ ریزاں
تمھارے درشن کی دید پانے کو
لاکھ عشاق منتظر ہوں
کہ جس کے کاسے میں ایک درھم بھی دید کا ہو
دھمال ڈالے، کمال ڈالے
وہ رات شبِ برات اُس کی
اور دن یقیناً وہ عید کا ہو
سنو اے لڑکی
حسین لڑکی
میں جانتا ہوں
ہزار امراء، حسین زادے
کہ شہنشاہ اور شاہزادے
وہ جاہ و حشمت، متاعِ ہستی
تمہارے قدموں میں ڈالنے کو تُلے ہوئے ہیں
تمہاری خاطر
نجانے کتنے شریف زادے رُلے ہوئے ہیں
تری طلب میں یوں ہاتھ باندھے وہ سب
کے سب یوں کھڑے ہوئے ہیں
کہ تاج و تخت بھی نوکِ پاپوش پر کبھی کے پڑے ہوئے ہیں
حسین لڑکی!
تمہاری چشمِ کرم یہ مجھ پہ
عجیب الجھن بنا رہی ہے
میں ایک شاعر
غریب شاعر
کہ جس کے سپنے بکھر چکے ہیں
اور آنکھیں پتھر کی ہو چکی ہیں
تمام میلہ ہی لُٹ گیا ہے
تمام منظر اُجڑ چکے ہیں
جو اک ادھورا وجود لے کر بھٹک رہا ہے نجانے کب سے
اور اس کے شانوں پہ بوجھ بھی ہیں رواجوں کے
بتاؤ کیسے ۔۔۔۔۔
تمہارا حق وہ ادا کرے گا
جو خود ادھورا ہے زندگی میں
وہ کیا کسی سے وفا کرے گا

ارشد محمود ارشد

مسجدِ اقصیٰ

لہو میں جب بھی نہاتی ہے مسجدِ اقصیٰ
تڑپ کے ہم کو بلاتی ہے مسجدِ اقصیٰ

گرے ہیں پستیوں میں ہم، بلند تھے کتنے
یہ بات یاد دلاتی ہے مسجدِ اقصیٰ

دِکھا دِکھا کے شہیدوں کی بے کفن لاشیں
حرم کو خون رُلاتی ہے مسجدِ اقصیٰ

جو یاد آتی ہے معراجِ نوشۂ اسریٰ
تو رُوح میں اُتر آتی ہے مسجدِ اقصیٰ

کہاں ہے انجمنِ اقوام؟ پوچھئے اُس سے
اُداس کیوں نظر آتی ہے مسجدِ اقصیٰ

کریں یہود و نصاریٰ نہ فکر، جلدی ہی
حساب سارے چکاتی ہے مسجدِ اقصیٰ

غزہ کے حال پہ گریاں ہے قبلۂ اوّل
مسلسل اشک بہاتی ہے مسجدِ اقصیٰ

اُجڑ رہا ہے فلسطین، دیسِ نبیوں کا
دُعا کو ہاتھ اُٹھاتی ہے مسجدِ اقصیٰ

فیض رسول فیضان

شاہِ سخن

[آبروئے سخن حضرت توصیف تبسم کے لیے ۲۰۲۴ء میں لکھی گئی نظم]

سہسوان۔
بادشاہوں کی سیر و سیاحت کا مرکز
بابرکت، باعثِ برکت، مسبب البرکت "پریوں کا
کنواں" مذہب کی بھینٹ چڑھا ہے
عقیدت، محبت، ایثار و شکر!
توصیف نے اسی سکول سے شعر کہا ہے
غزل و نظم
اور نثم
فطرت سے بھرے غم رکھتا ہے، تازہ اور
اداس رکھتا ہے
روایت کا شاہد، درایت کا ہم سر
سہسوان کی اُجلی تصویر....
اسلام آباد کی رات کے گھنے اندھیرے چھائے،
جو اجلے اور اجالے ہیں
ہجرتِ نو آبادکاری کے سبب یہاں خیمے لگائے ہے
شاہدِ حالات قلم بند
"بند گلی میں شام" گزارتا ہے
اُس دور کی حالت تھی: استاد، محقق اور مشفق
نہایت سادہ نفاست مزاج آدمی
مچھندر اور بانکے، دریاؤں کی روانیاں، آنکھوں
کی پتلیاں، شجرہائے نغمہ دار ہیں

آنسو جو چپکے بہتا لہو ہے
زخم رستا ہے، ہر انشانِ رنگ رکھتا ہے
توصیف تبسم کا ستارا" کوئی اور ستارہ"

نہ ہوئے نہ ہوئے محمد احمد توصیف تبسم کسی
عہدے کے طلب گار
ہمیشہ طالب علموں کے رہنما اور حوصلہ افزا رہے
آپ محنت و لگن کا سرمایہ تھے
کتاب دوست، انسان دوست، نصیر الدین نصیر
کے دوست

سوال ہُوا گزرے ہوئے دن فرماتے تھے:
آپ آبروئے سخن حضرت ڈاکٹر توصیف
تبسم ہم میں نہ رہے!

ابنِ حسین شعیب الرحمٰن

زندگی کے روپ

زندگی تو خود اب تو زندگی سے خائف ہے
برہنہ زمانے میں زندگی طوائف ہے

خامشوں کے بستر پر سرد سرد آہوں میں
ڈولتی پھرے اب تو زندگانی راہوں میں
ہے کبھی خوشی تو غم کیا سکون ملتا ہے
یہ کبھی ہے بادل میں اور کبھی گھٹاؤں میں

کس قدر ہوا بے بس زندگی کا آئینہ
بے جوان لاشوں میں اور بوڑھی ماؤں میں
رقص کرتی رہتی ہے شاہ کے محلوں میں
کٹیا میں غریبوں کی آتی ہے یہ سالوں میں

آنکھ میں بیماروں کی بچوں کی کتابوں میں
رقص کرتی ہے یہ تو گلیوں میں محلوں میں
گھنگروں اس کے پاؤں میں تھی بلا کی مجبوری
ناچتی ہے دھوپوں میں اور کبھی یہ چھاؤں میں

بے بسی کی اک تصویر زندگانی ہے یارو
بے جوان لاشوں میں اور بوڑھی ماؤں میں
پہلے اس کی رونق تھے یہ کتابیں اور چوپال
بٹ گئی ہے اب تو یہ بے شمار حصوں میں

گاڑیوں کی زینت تھی ریل گاڑیوں جیسی
زندگی نہیں آتی اب کسی پناہوں میں
والدین کے خوابوں کا نگر نہیں اب یہ
اب کہاں یہ ملتی ہے ادھ کھلے گلابوں میں

روز روز مرتی ہے روز روز جیتی ہے
زندگانی ملتی ہے اب تو بس کتابوں میں
کوٹھیوں میں پلتی ہے عیش اور عشرت سے
پر سکوں نہیں رہتی شہر اور گاؤں میں

اوٹ میں سڑک کی اب رُلتی پھرتی ہے مظلوم
اب کبھی نہیں آتی امن کی یہ چھاؤں میں
سرخ نیلے پھولوں میں تھی بہار کی مانند
کھو گئی نہ جانے کیوں ہجر کی گھٹاؤں میں
زندگی کے پیچھے ہے اور زندگانی اک
ڈھونڈتی ہے خود کو یہ اپنے آشناؤں میں

زندگی میں خوشبو ہے رنگ ہے حقیقت کا
ڈھول بن گئی ہے اب دیکھو پارساؤں میں
زندگی کی منزل ہے اور نہ ہے کوئی رستہ
یہ تلاش کرتی ہے خود کو اپنے پاؤں میں

جس طرح بھی ممکن ہو عابدی نبھائے جا
قصے زندگی کو تو درد کے سنائے جا
زندگی عطا بھی ہے زندگی ہے نعمت بھی
زندگی کے نغمے تو وجد میں سنائے جا

زندگی تو خود اب تو زندگی سے خائف ہے
برہنہ زمانے میں زندگی طوائف ہے

علی حسین عابدی

محبت کی کائنات

میری ذات سے جڑی

تیری ذات ہے

جیسے آسمان پر

دعا کا رشتہ کائنات سے ہے

جیسے تتلیاں پھولوں پر

جیسے جگنو کا تعلق برسات سے ہے

ہم دونوں کے درمیان

رابطہ جو قائم ہے

اس رابطے کا محور

محبت کی بات ہے،

فصیحہ آصف خان

عشق عشق

عشق

پہلا عشق... جیسے پہلی بار موسمِ بہار آیا ہو

جیسے دل نے پہلی دفعہ دھڑکنا سیکھا ہو

وہ نظریں، جو پل بھر کو ملیں تو زمانہ تھم جائے

وہ مسکراہٹ، جو دل کی دنیا بدل جائے

نہ سمجھ تھی، نہ ہنرِ گفتگو

بس ایک خاموشی تھی، اور دل کی دھڑکنوں کی گفتگو

ہر لمحہ اُس کے نام، ہر خواب اُس کے ساتھ

دن روشن اُس کے خیال سے، راتیں اُس کی باتوں کے ساتھ

اک جھجک تھی، اک ڈر بھی — کہ کہیں یہ خواب ٹوٹ نہ جائے

مگر دل تھا کہ بس اُسی کی راہ تکے جائے

پہلا عشق... نازک سا، کچا سا

مگر سچا، معصوم، اور سب سے اچھا سا

وہ جو پہلی بار کسی کے لیے دل بے قرار ہوا

وہ پہلا لمحہ — جب "ہم" کا تصور شروع ہوا

پہلا عشق، جو شاید نہ ملا، نہ مکمل ہوا

پر جو زندگی بھر دل میں ایک جگنو سا چمکتا رہا

سیدہ فاطمہ جبیں

اعتراف

صرف تم جانتے تھے
بارش مجھ کو اچھی نہیں لگتی تھی
مجھ جیسی رنگ بھری لڑکی بارش میں کیوں بھیگے گی
تم کیسے جادوگر ہو
اک لمحے میں میری آنکھیں بند کر دو گے
جانے کیا منتر پڑھ کے پھونکو
میرے سارے رنگ ایک دوجے میں گھل مل جائیں گے
آنکھوں سے وہ بارش ہو گی
سارے رنگ ہی ڈھل جائیں گے

میں بے رنگ سی ہو کر
زمین پر بہتے رنگوں کو دیکھتی ہوں
سوچتی ہوں
تم تو دل کے اندھے تھے
میں نے تم کو رنگ برنگے
منتر پڑھ کے ہنسانے والا سمجھ لیا تھا
میں ہی غلط تھی سوچ رہی ہوں

بشریٰ شیریں

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

کون دیوان خالد پڑھے گا یہاں
ہم نوا کیا، کہ اب ہم زباں بھی نہیں

خوابوں بھری دنیا

عبداللہ نوید

یہ دنیا ایک مثال ہے
محض ایک مثال،
یا پھر کوئی خیال
اور خیال بھی ایک ایسے شخص کا
جو اپنی ناک سے آگے دیکھ سکنے کی سکت تک
نہیں رکھتا

دنیا والوں کی آنکھوں کے عین سامنے
ایک پرندہ پانی کو ترستا،
زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہے
کوئی ہے جو اُسے راستہ دکھائے

دنیا نے آنکھوں پر بے حسی کی پٹی باندھ رکھی ہے
ایک بڑھیا میلی کچیلی چادر بدن پر لپیٹے
تپتے دن میں اپنے بچے کے لاپتہ ایک لقمے
کی تلاش میں ہے
وہ لقمہ جو خدا جانے کس سود خور کی جیب میں
سسکیاں بھر رہا ہوگا!

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات ہوا پلٹ گئی ، گردِ لباس چھٹ گئی
دشت کی وسعتیں ملیں ، وادیٔ سایہ دار میں

یاد کا عذاب

بھول بیٹھا ہوں آس پاس کو میں
بس تیری دوری یاد ہے مجھکو
تجھکو دیکھا تھا جستہ جستہ کبھی
پوری کی پوری یاد ہے مجھکو

اپنی عدالت

میں کسی بات پہ یکدم کبھی راضی نہ ہوا
حال میں رہتا رہا یوں مرا ماضی نہ ہوا
میں نے خود اپنی عدالت میں پکارا خود کو
پوری پیشی میں وکالت ہوئی قاضی نہ ہوا

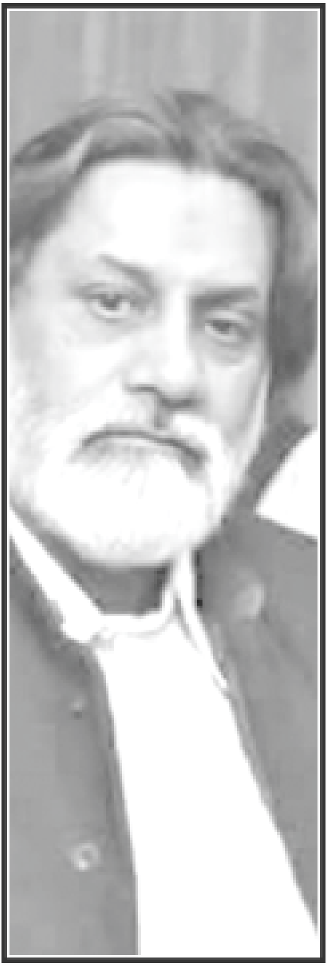

اعجاز رضوی

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

کیا کہوں شہرِ غزالاں کبھی دیکھا ہی نہ تھا
جانِ جاں! میں نے یہ زنداں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

تشبیب
خالد احمد
ایک مٹھی ہوا
خالد احمد
خالد احمد
جدید تر پاکستانی ادب
خالد احمد
دراز پلکوں کے سائے سائے
خالد احمد
خالد احمد

جناب احمد ندیم قاسمی، محترمہ منصورہ احمد، منظر حسین اختر،
جناب اسد احسان، جناب عبدالغفار، جناب نجیب احمد،
جناب خالد احمد

جناب عمران منظور، جناب امجد اسلام امجد، جناب خالد احمد

جناب خالد احمد، جناب افتخار عارف، جناب عدنان بیگ،
جناب اعجاز رضوی

جناب عدیم ہاشمی، جناب جاوید انور، جناب اعجاز رضوی،
جناب شفیق سلیمی، جناب خالد احمد

جناب یوسف حسن، جناب نجیب احمد، جناب خالد احمد

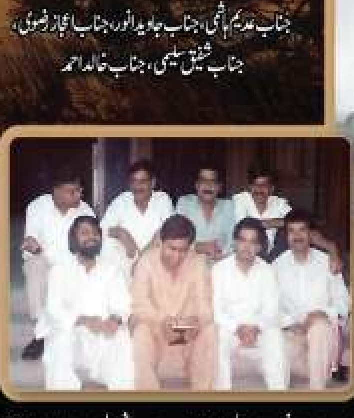

جناب حامد یزدانی، جناب علی اصغر عباس، جناب انجم سلیمی، جناب اعجاز رضوی
جناب جاوید انور، جناب ناہید شاہد، جناب نجیب احمد، جناب خالد احمد